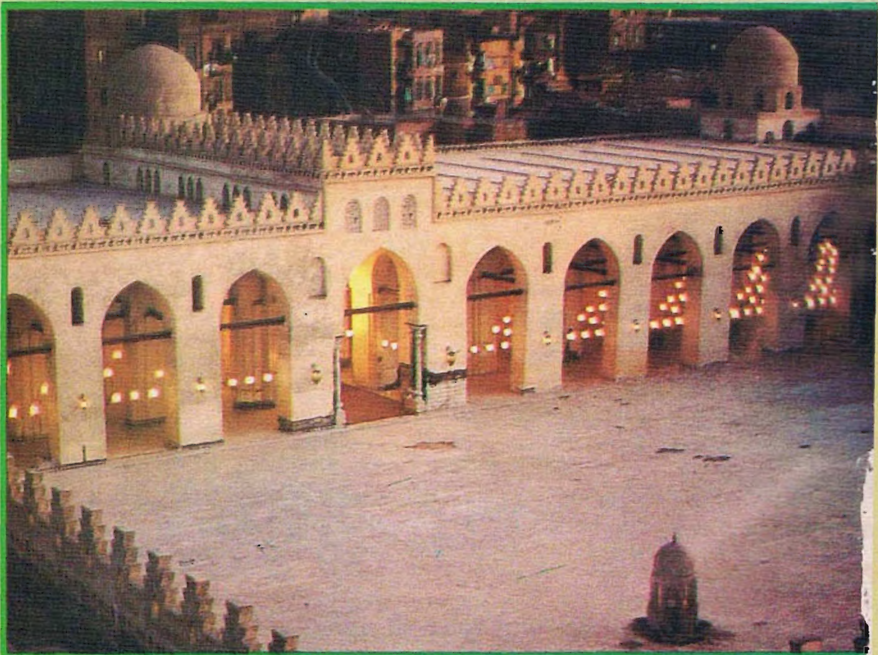
الرسالہ

Al-Risala

January 1999 • No. 266 • Rs. 9

دشمن کے مسئلہ کو حل کرنے کی زیادہ آسان تدبیر
یہ ہے کہ دشمن کو دوست بنالیا جائے۔



The Mosque of Al-Hakim, Cairo

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الرسالہ
Al-Risāla

اردو، ہندی اور انگریزی میں شائع ہونے والا
اسلامی مرکز کا ترجمان

زیر سرپرستی
مولانا وحید الدین خاں
صدر اسلامی مرکز

Al-Risāla
1, Nizamuddin West Market, Near DVB Office,
New Delhi-110013
Tel. 4611128 Fax 4697333, 4647980
e-mail: risala.islamic@axcess.net.in
website: http://www.alrisala.org

SUBSCRIPTION RATES
Single copy Rs. 9
One year Rs. 100. Two years Rs. 195
Three years Rs. 290. Five years Rs. 480
Abroad: One year $ 10/£6 (Air mail)

DISTRIBUTED IN ENGLAND BY
IPCI: ISLAMIC VISION
481, Coventry Road, Birmingham B10 0JS
Tel. 0121-773 0137, Fax: 0121-766 8577
e-mail: info@ipci-iv.co.uk

DISTRIBUTED IN USA BY
AL-RISALA FORUM INTERNATIONAL
1439 Ocean Ave., 4C Brooklyn
New York NY 11230 Tel./Fax 718-2583435
e-mail: Kaleem@alrisala.org

Printed and published by Saniyasnain Khan on behalf of The Islamic Centre, New Delhi. Printed at Nice Printing Press, Delhi.

جنوری ۱۹۹۹ شمارہ نمبر ۲۶۶

فہرست	صفحہ

روزہ کا مقصد آدمی کی روحانیت کو جگانا اور اس کو ربّانی انسان بنانا ہے۔

قرآن میں یہ تعلیم دی گئی ہے کہ ۔۔۔ تم لوگ ربانی بنو(آل عمران ۷۹) اس کا مطلب کیا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ رب والے یا اللہ والے بن کر زندگی گذارو۔ خود پرستی کی زندگی کو چھوڑ کر خدا پرستی کی زندگی اختیار کرو۔

دنیا میں زندگی کی دو قسمیں ہیں۔ ایک ہے اپنی خواہشوں کے زیر اثر زندگی گذارنا۔ اور دوسرا ہے خدا کی مرضی کے زیر اثر زندگی گذارنا۔ ربّانی انسان وہ ہے جو خدا کو اپنا سب کچھ بنالے۔ وہ اسی کی یاد میں جیئے۔ وہ ہر معاملہ میں خدا کی مرضی کو جاننے کی کوشش کرے اور جو خدا کی مرضی ہو اس پر اپنی زندگی کو ڈھال لے۔ اس کے برعکس غیر ربانی انسان وہ ہے جو اپنے آپ میں جیتا ہو۔ جس کے لئے اس کی خواہشیں ہی سب کچھ ہوں۔ جو اپنی خواہشوں کی تکمیل کو اپنی زندگی کا مقصد بنائے ہوئے ہو۔

رمضان کے مہینے کا روزہ کسی آدمی کو ربّانی انسان بنانے کی تربیت ہے۔ روزہ آدمی کی ذاتی خواہشوں پر پابندی لگاتا ہے۔ روزہ یہ سبق دیتا ہے کہ اپنی ذات کے لئے جینے کے بجائے خدا کے لئے جیو۔ اپنی خواہشوں کو سب کچھ سمجھنے کے بجائے صرف خدا کو اپنا سب کچھ بنالو۔

روزہ آدمی کو ربّانی انسان بنانے کی ایک سالانہ تربیت ہے۔ اور یہی وہ لوگ ہیں جن کے لئے دنیا اور آخرت کی کامیابیاں مقدر کی گئی ہیں۔

روزہ کیا ہے .....

روزہ اخلاقی ڈسپلن کی سالانہ تربیت ہے

نظم یا ڈسپلن ہر معاملہ میں کامیابی کے لئے ضروری ہے، خواہ وہ دنیا کا معاملہ ہو یا دین کا معاملہ۔ نظم یا ڈسپلن صحتِ کار کی ضمانت ہے۔ کسی کام کی بخوبی ادائیگی اس کے بغیر ممکن نہیں۔

اسلام میں نماز کو مقرر اوقات میں فرض کیا گیا ہے۔ روزہ اور دوسری عبادات بھی مقرر تاریخوں میں اور مقرر وقت پر ادا کی جاتی ہیں۔ یہی معاملہ تمام دینی اعمال کا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ نظم اور ڈسپلن کے بغیر کوئی بھی اسلامی عمل صحیح طور پر ادا نہیں کیا جا سکتا۔

روزہ نظم اور ڈسپلن کی اسی اسپرٹ کو پیدا کرنے کا ذریعہ ہے۔ رمضان کا پورا مہینہ روزہ دار کو سخت ڈسپلن کے تحت گذارنا ہوتا ہے۔ سونا اور جاگنا، کھانا اور پینا، غرض ہر مشغولیت کو ایک سخت قسم کے نظام الاوقات کے تحت انجام دینا ہوتا ہے۔ اس طرح کی ایک منظّم زندگی پورے مہینہ تک جاری رہتی ہے۔ اس طرح کی ایک ماہانہ زندگی آدمی کو اس قابل بنادیتی ہے کہ وہ سال کے بقیہ مہینوں میں بھی نظم اور ڈسپلن کے تحت زندگی گذارے۔

روزہ ایک مومن کے لئے اخلاقی ڈسپلن کی سالانہ تربیت ہے۔ روزہ آدمی کے اندر یہ مزاج پیدا کرتا ہے کہ وہ دنیا میں اس طرح رہے کہ وہ ایک بااصول انسان بنا ہوا ہو۔ وہ اپنے آپ کو پوری طرح خدا کے کنٹرول میں دیئے ہوئے ہو۔

روزہ خود انضباطی (سلف کنٹرول) کی مشق ہے۔ وہ ذمہ دارانہ زندگی گذارنے کی ایک سالانہ تربیت ہے۔

میزان، حدید

قرآن کی سورہ نمبر ۵۷ میں ارشاد ہوا ہے کہ ۔۔۔ ہم نے اپنے رسولوں کو نشانیوں کے ساتھ بھیجا اور ان کے ساتھ اتارا کتاب اور ترازو، تاکہ لوگ انصاف پر قائم ہوں۔ اور ہم نے لوہا اتارا جس میں بڑی قوت ہے اور لوگوں کے لئے فائدے ہیں اور تاکہ اللہ جان لے کہ کون اس کی اور اس کے رسولوں کی مدد کرتا ہے بن دیکھے، بے شک اللہ طاقت والا، زبردست ہے (الحدید ۲۵)

اللہ تعالیٰ نے ہر زمانہ میں انسان کی ہدایت کے لئے پیغمبر بھیجے۔ ان پیغمبروں کے ساتھ ایک طرف ایسی روشن نشانیاں ہوتی تھیں جو ان کے پیغمبر خدا ہونے کو ثابت کر رہی ہوں۔ دوسری طرف ان کے ساتھ خدا کی کتاب ہوتی تھی جس میں انسان کے لئے صحیح رہنمائی درج ہو۔ اب محمد ﷺ خدا کے آخری رسول ہیں اور قرآن خدا کی آخری کتاب۔ خدائی کتاب کے مطابق، انسان کی دو ذمہ داریاں ہیں۔ ایک یہ کہ وہ خود قسط (انصاف) پر قائم ہو۔ دوسرے یہ کہ وہ حق کے لئے اٹھنے والوں کی نصرت (مدد) کرے۔ ان دو طرفہ ذمہ داریوں کو ادا کرنے کے بعد ہی کوئی انسان خدا کی نظر میں اس قابل بنتا ہے کہ اس کو ابدی انعام سے سرفراز کیا جائے۔ اسی کے ساتھ خدا نے یہ کیا کہ دونوں قسم کے عمل کے لئے دنیا میں مادی مثالیں قائم کر دیں۔ یہ مادی مثالیں یہ ہیں۔ ترازو اور لوہا۔

ترازو ٹھیک اور صحیح ناپ کا ذریعہ ہے، وہ کبھی کسی چیز کو کم یا زیادہ نہیں ناپتا۔ یہی صفت انسان کے اندر اخلاق کے اعتبار سے ہونا چاہئے وہ لین دین میں یا معاملہ کرنے میں پورا پورا انصاف برتے، وہ قسط کی روش سے ذرا بھی نہ ہٹے۔ اس کا کیریکٹر ترازو کی طرح عادلانہ کیریکٹر بن جائے۔

اسی کے ساتھ دوسری مطلوب چیز یہ ہے کہ آدمی ہمیشہ حق و صداقت کا ساتھ دے۔ جب بھی کچھ لوگ کسی امر حق کے لئے اٹھیں تو وہ ان کا قابل اعتماد مددگار بن جائے۔ اس معاملہ میں وہ لوہے جیسی پختگی کا ثبوت دے۔ حق کی نصرت کے لئے وہ لوہا پُرش بن جائے۔ وہ حدیدی کردار کے ساتھ حق کی حمایت کرے۔

بامعنی زندگی

زندگی ہر ایک کو ملتی ہے۔ مگر کوئی بے معنی زندگی گذار کر مر جاتا ہے۔ اور کوئی شخص اپنی زندگی کو بامعنی بنانے میں کامیاب ہوتا ہے۔ دو انسانوں میں یہ فرق کیسے ہوتا ہے۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ تمام انسان فطرت سے یکساں صلاحیت لے کر پیدا ہوتے ہیں۔ پھر وہ کیا چیز ہے جو ایک ہی قسم کے دو انسانوں میں اتنا بڑا فرق پیدا کر دیتی ہے۔ اس کا بنیادی سبب صرف ایک ہے۔ اور وہ ہے شعور کا استعمال یا عدم استعمال۔

ایک انسان وہ ہے جو اپنے شعور کو کام میں نہ لائے بلکہ دوسروں کے زیر اثر عمل کرے۔ بلکہ وہ حالات کا معمول بن کر زندگی گذارے۔ اس کے گرد و پیش کے احوال اس کو جیسا بننے کے لئے کہیں وہ ویسا ہی بنتا چلا جائے۔ دنیا اس کو جس سانچے میں ڈھالے، وہ اسی میں ڈھلتا چلا جائے، خواہ وہ سانچہ صحیح ہو یا غلط۔

یہ وہ انسان ہے جس کی زندگی معنویت سے خالی رہی۔ وہ ایک حیوان کی طرح جیا اور ایک حیوان کی طرح مر گیا۔ فطرت نے اس کو ایک بامعنی وجود کے ساتھ دنیا میں بھیجا تھا، مگر جب وہ دنیا سے رخصت ہوا تو صرف ایک بے معنی وجود کی حیثیت رکھتا تھا۔

دوسرا انسان وہ ہے جس نے اپنے شعور کو زندہ رکھا۔ جس نے اپنے عقل کو استعمال کیا۔ اس نے آزادانہ غور و فکر کے تحت اپنے آپ کو بھی جانا اور دنیا کو بھی۔ اس نے صحیح اور غلط میں فرق کیا۔ اس نے اخلاق انسانی کے ابدی اصولوں کی پابندی کی۔ اس نے ایک بااصول اور ایک باکردار انسان کی زندگی گذاری۔ وہ اسی پر جیا اور اسی پر مرا۔ یہ دوسرے قسم کا انسان ہی حقیقی انسان ہے۔ اس کی زندگی بھی بامعنی تھی اور اس کی موت بھی بامعنی۔

جلدی نہیں

جب میں نوجوان تھااور یوپی کے ایک گاؤں میں رہتا تھا تو مجھے یہ شوق ہوا کہ میرے گھر کے آنگن میں آم کا ایک درخت ہو۔ اب ایک صورت یہ تھی کہ میں آم کا ایک چھوٹا پوداا پنے آنگن میں لگاؤں اور سالوں تک اس کے بڑھنے کا انتظار کروں۔ مگر نوجوانی کے جوش میں میں اس انتظار کے لئے تیار نہ تھا۔ میں چاہتا تھا کہ اچانک ہی میرے گھر میں آم کا ایک بڑا سا درخت دکھائی دینے لگے۔

وہاں میرا آموں کا باغ تھا۔ اس میں پانچ سال کا ایک درخت تھا جو بڑھتے بڑھتے انسانی قد سے اونچا ہو چکا تھا۔ اور خوب ہرا ابھرا تھا۔ میں نے کئی مزدور اس پر لگا دیئے۔ وہ دن بھر اس کی کھودائی کرتے رہے آخر کار شام کو وہ درخت ایک بڑی چارپائی پر رکھ کر گھر کے اندر لایا گیا اور آنگن میں گڈھا کھود کر اس کو وہاں لگا دیا گیا۔

میں بہت خوش تھا کہ میں نے بڑا درخت لگا کر پانچ سال کا سفر ایک دن میں طے کر لیا ہے۔ مگر رات کو سو کر جب میں صبح کو اٹھا تو درخت کے پتے مرجھائے ہوئے نظر آئے۔ لیکن ابھی میں مایوس نہیں ہوا۔ میں نے اس میں خوب پانی ڈالا میں نے سمجھا کہ پانی پا کر اس کے پتے ہرے ہو جائیں گے۔ مگر ایسا نہیں ہوا۔ اگلے دن اس کے پتے اور زیادہ مرجھا گئے۔ یہاں تک کہ چند دنوں میں وہ درخت بالکل سوکھ گیا۔

نوجوانی کی عمر کا یہ تجربہ میرے لئے بہت سخت ثابت ہوا۔ وہ میرے لئے زندگی بھر کا تجربہ بن گیا۔ اس سے میرے اندر گہرائی کے ساتھ یہ سوچ پیدا ہوئی کہ زندگی میں کوئی شارٹ کٹ نہیں۔ زندگی ایک لمبا سفر ہے اور اس کو ہر حال میں لمبے دنوں ہی میں پورا کرنا ہے۔

اس واقعہ کے بعد مجھ پر یہ کھلا کہ دنیا میں انسان کا معاملہ ففٹی ففٹی جیسا ہے۔ یعنی دنیا میں جو کام بھی کرنا ہو اس میں ایک حصہ انسان کا ہوتا ہے اور دوسرا حصہ نیچر کا۔ دنیا میں ہر واقعہ انسان اور نیچر دونوں کی مطابقت سے پورا ہوتا ہے۔ انسان اگر جلدی چاہے اور نیچر کا طریقہ جلدی کا طریقہ نہ ہو تو ایسی حالت میں محض انسان کے چاہنے سے کوئی نتیجہ نکلنے والا نہیں۔ اس واقعہ نے مجھے ہمیشہ کے لئے اس معاملہ میں محتاط بنادیا۔

انسان اور نیچر کی مثال کاگ وہیل جیسی ہے۔ کاگ وہیل میں دونوں کاگ ایک ساتھ چلتے ہیں۔ اگر ایک کاگ اپنی رفتار کو دوسرے کاگ سے تیز کرنا چاہے تو سارا نظام بگڑ کر رہ جائے گا۔ انسان کا کاگ کمزور ہے اور نیچر کا کاگ طاقت ور۔ ایسی حالت میں اگر انسان اپنی کاگ کی رفتار بڑھانا چاہے تو اس کا انجام صرف یہ ہوگا کہ انسان کا کاگ ٹوٹ جائے۔ کیونکہ نیچر کا کاگ تو اتنا طاقتور ہے کہ وہ کسی حال میں ٹوٹنے والا نہیں۔

درخت کے معاملہ میں مجھ کو جو تجربہ ہوا، وہ میری زندگی کا آخری تجربہ بن گیا۔ اس کے بعد پھر میں نے کبھی ایسا نہیں کیا کہ جو کام دھیرے دھیرے ہونے والا ہو اس کو اچانک کرنا چاہوں۔ اس کے بعد ہر کام میں میں یہ سوچنے لگا کہ اس کا حقیقی اسٹارٹنگ پوائنٹ کیا ہے۔ کیونکہ اس دنیا میں آپ درمیان سے یا آخر سے اپنا سفر شروع نہیں کرسکتے۔ آپ کو ہر حال میں وہیں سے اپنا سفر شروع کرنا ہے جہاں سے نیچر کے مطابق وہ شروع ہوتا ہے۔

شاک ٹریٹمنٹ

قرآن میں بتایا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو مشقت میں پیدا کیا ہے (لقد خلقنا الانسان فی کبد) اسی طرح قرآن میں ارشاد ہوا ہے کہ بے شک انسان گھاٹے میں ہے (ان الا نسان لفی خسر) اس سے معلوم ہوا کہ اس دنیا میں انسان کا کیس لازمی طور پر خسران کا کیس ہے۔ یہ خود خالق کا مقدر کیا ہوا ہے، اس لئے یہ ناممکن ہے کہ کوئی انسان اس سے بچ سکے۔

اب سوال یہ ہے کہ گھاٹے کے اس معاملہ میں نفع کا پہلو کیا ہے۔ غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ اس کا روحانی پہلو ہے۔ عملی اعتبار سے اس دنیا میں ہر انسان کو نقصان اور تباہی سے سابقہ پیش آتا ہے۔ ہر انسان کے لئے لازمی طور پر یہ مقدر ہے کہ وہ غلطیاں کرے۔ اب کامیاب وہ ہے جس کے اندر ان تلخ تجربات کے بعد خود احتسابی کا جذبہ جاگے۔ جو اپنے آپ پر نظر ثانی کر کے زندگی کی حقیقت کو سمجھنے کی کوشش کرے۔

خود احتسابی کا یہ تعمیری عمل صرف اس انسان کے اندر جاری ہوتا ہے جو اعتراف پر راضی ہو۔ جو واقعات کا بے لاگ جائزہ لے اور پھر اپنی کوتاہیوں کا کھلے طور پر اعتراف کرے۔

دوسرے الفاظ میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ اس دنیا میں آنے والا ہر آدمی مریض ہے۔ زندگی کے تجربات اسی فطری بیماری کو دور کرنے کے لئے شاک ٹریٹمنٹ کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ہر آدمی گویا ایک مریض ذہن ہے۔ کامیاب وہ ہے جس کا خاتمہ اس طرح ہو کہ وہ اپنے مریض ذہن کی اصلاح کر کے اس کو ایک صحت مند ذہن بنا سکا ہو۔ ایسے ہی لوگ موت کے بعد والی دنیا میں کامیاب زندگی کے حق دار ہوں گے۔

فطرت سے انحراف

قرآن (النساء ۱۱۹) میں بتایا گیا ہے کہ آدم کو سجدہ نہ کرنے پر جب اللہ تعالیٰ نے شیطان کو نکالا تو اس نے کہا کہ میں آدم کی ذریت کو گمراہ کروں گا۔ اس سلسلہ میں اس نے جو باتیں کہیں ان میں سے ایک یہ تھی کہ ۔۔۔ اور میں ان کو حکم دوں گا تو وہ خدا کی بناوٹ کو بدل دیں گے (ولامرنهم فليغيرن خلق الله) انسان کو گمراہ کرنے کے لئے شیطان کا جو طریقہ ہے ان میں سے ایک یہ ہے کہ وہ انسان کی سوچ کو فطرت کے راستہ سے ہٹا دے۔ لوگ فطرت کے اصولوں کو چھوڑ کر خود ساختہ اصولوں پر زندگی کی تشکیل کرنے لگیں۔ اسی کو یہاں تغییر خلق کہا گیا ہے۔

اس تغییر خلق کی بہت سی صورتیں تاریخ میں ملتی ہیں۔ موجودہ زمانہ میں اس کی ایک مثال مغرب کا وہ نظریہ ہے جو عورت اور مرد کے تعلق کے بارے میں قائم کیا گیا ہے۔ فطرت کے مقرر اصول کے مطابق، عورت اور مرد کے درمیان صحیح ازدواجی تعلق یہ ہے کہ اس کو نکاح کی بنیاد پر قائم کیا جائے۔ مگر جدید مغربی تہذیب نے اس کو نکاح کے بجائے محبت (love) کی بنیاد پر قائم کر دیا۔ یعنی عورت اور مرد کے درمیان ازدواجی تعلق کے لئے صرف محبت کافی ہے، نکاح کی کوئی ضرورت نہیں۔

فطرت کے نقشہ میں یہ تبدیلی اتنی سنگین تھی کہ اس نے انسانی زندگی کے تمام پہلوؤں کو فساد اور بگاڑ سے بھر دیا۔ عورت اور مرد کا رشتہ تقدس پر قائم نہ رہا بلکہ صرف مسرت (pleasure) پر قائم ہو گیا۔ انسانی تعلقات میں ساری اہمیت اس کے مادی پہلو کو حاصل ہو گئی۔ عورت اور مرد حیوانوں کی مانند زندگی گزارنے لگے۔ حرام و حلال کی حد

بندی کا خاتمہ ہو گیا۔ لطیف احساسات لی جگہ صرف لذت اندوزی، زندگی کا مرکز و محور بن گیا۔

یہ تبدیلی اتنی دوررس تھی کہ اس کے نتیجہ میں اقدار کا نظام (value system) پوری طرح بدل گیا۔ انسانی اخلاق کسی اعلیٰ اصول کا پابند نہ رہا بلکہ صرف مادی تقاضوں کا پابند بن گیا۔

مغربی تہذیب کی تمام غلطیوں میں شاید سب سے بڑی غلطی یہ ہے کہ اس نے عورت اور مرد دونوں کو فطرت کے راستہ سے ہٹا دیا۔ فطرت کے مطابق، عورت اور مرد کے درمیان ازدواجی تعلق کی واحد درست بنیاد نکاح ہے۔ لیکن مغربی تہذیب نے اس تعلق کو نکاح کے بجائے محبت (بالفاظ دیگر شہوت) کی بنیاد پر قائم کر دیا۔ اس تبدیلی کا بھیانک نتیجہ یہ ہوا کہ انسانی معاشرت کا یہ شعبہ فساد کا شکار ہو کر رہ گیا۔

محبت ایک جذباتی کیفیت ہے، جب کہ نکاح ایک ذمہ داری کا عنوان ہے۔ مرد اور عورت کے درمیان خدا نے طرفین کے لئے ایک فطری کشش رکھی ہے۔ اس بنا پر جب ایک نوجوان مرد اور ایک نوجوان عورت آزادانہ طور پر باہم ملیں تو دونوں اپنے دل میں ایک دوسرے کے لئے کشش محسوس کرتے ہیں۔ اسی کشش کو مغربی تہذیب میں محبت کا نام دیا گیا ہے۔ حالانکہ اپنی حقیقت کے اعتبار سے وہ صرف شہوت ہوتی ہے۔ اس طرح مغربی تہذیب میں شہوت کو محبت کا خوبصورت نام دے کر جنسی بے راہ روی کو جائز قرار دے دیا گیا۔ نکاح کا طریقہ طرفین پر لازم قرار دیتا ہے کہ وہ اس فطری جذبہ کو فطرت کی حد میں رکھیں۔ وہ محبت کو ذمہ داری کے تابع بنائیں نہ کہ ذمہ داری کو محبت کے تابع کر دیں۔ جس کا نتیجہ بدترین سماجی فساد ہے۔

خودپسندی

عورت اور مرد دونوں کی مشترک کمزوری یہ ہے کہ دونوں پیدائشی طور پر خودپسند ہوتے ہیں۔ عورت کی خودپسندی اس کو ذاتی آرائش کی طرف لے جاتی ہے۔ جس کا اشارہ قرآن کی سورہ الزخرف (آیت ۱۸) میں کیا گیا ہے۔ مرد کی خودپسندی اس کے اندر فخر اور عظمت کا احساس پیدا کر دیتی ہے۔ جس کا ذکر قرآن کی سورہ النساء (آیت ۳۶) میں ملتا ہے۔

عورت اور مرد کے اندر یہ جذبات پیدائشی طور پر موجود ہوتے ہیں۔ مگر وہ صرف آزمائش کے لئے ہیں۔ یہ وہ مقام ہے جہاں عورت اور مرد دونوں کا امتحان لیا جا رہا ہے۔ اس آزمائش میں جو کامیاب ہو وہی کامیاب ہے، اور جو ناکام ہو وہی ناکام۔

عورت کا رجحان فطری طور پر آرائش کی طرف ہوتا ہے۔ مگر عورت کی کامیابی یہ ہے کہ وہ اس جذبہ پر کنٹرول کرتے ہوئے اپنے آپ کو سادگی پسند بنائے۔ وہ نمائشی چیزوں سے اپنے آپ کو بچا کر مفید عملی سرگرمیوں میں مصروف رہے۔

اسی طرح مرد کے اندر اگرچہ فطری طور پر خودپسندی کا جذبہ ہے مگر وہ اس لئے نہیں ہے کہ آدمی اس کا اظہار کرتا پھرے۔ کامیاب انسان وہ ہے جو خودپسندی اور فخر کے اس جذبہ کو کنٹرول کرے۔ وہ فخر و مباہات کے بجائے تواضع اور انسانی خدمت کو اپنا دستور حیات بنائے۔ خدا اپنی دنیا میں ایسے عورت اور مرد دیکھنا چاہتا ہے جو ذاتی نمائش یا ذاتی فخر کے جذبات سے بلند ہوں۔ وہ اپنے لئے جینے کے بجائے دوسروں کے لئے جئیں۔ وہ خودپسندی کے بجائے خداپرستی کو اپنا شیوہ بنائیں۔ وہ ذاتی خول سے باہر نکل کر فطرت کے آفاقی نقشہ میں اپنی ذمہ داریوں کو ادا کریں۔

وقت کی پابندی

اسلام میں جو عبادتیں فرض کی گئی ہیں۔ وہ سب کی سب وقت اور مدت کے ساتھ فرض کی گئی ہیں۔ مثلاً روزہ اور حج کی فرضیت سال کے مخصوص مہینوں میں ہے۔ ایسا نہیں کیا گیا کہ جب چاہے روزہ رکھ لو اور جب چاہے حج ادا کرلو۔ نماز کے بارے میں قرآن میں ارشاد ہوا ہے کہ بے شک نماز اہل ایمان پر مقرر وقت کے ساتھ فرض ہے (ان الصلوٰۃ کانت علی المؤمنین کتابا موقوتا) النساء ۱۰۳

نماز کو متعین وقت پر ادا کرنے کا حکم کوئی سادہ بات نہیں، یہ نمازیوں کی پوری زندگی کی تنظیم وتربیت ہے۔ حدیث میں آیا ہے کہ مسجدیں متقیوں کا گھر ہیں (المساجد بیوت المتقین) دوسرے لفظوں میں یہ کہ مسجد تقویٰ کی تربیت کا مرکز ہے۔ اس تربیت کا ایک اہم جزء بلاشبہ وقت کی پابندی ہے۔ اہل ایمان سے یہ مطلوب ہے کہ وہ اپنی عبادتوں کو ان کے مقرر وقت پر ادا کریں۔ اور اسی طرح اپنی زندگی کے تمام معاملات کو نظم وضبط اور ڈسپلن کے اصول پر قائم کریں۔

اہل ایمان سے یہ مطلوب ہے کہ وہ گھڑی کے مطابق اپنے رات اور دن کا نقشہ بنائیں۔ ہر کام کو اس کے متعین وقت پر ادا کریں۔ جب بھی کوئی وعدہ کریں تو ٹھیک وقت پر اس کو پورا کریں۔ ہر وہ معاملہ جس کا تعلق وقت سے ہو اس کو وہ عین اس کے مقرر وقت پر انجام دیں۔ عبادتوں کو وقت کے ساتھ باندھ کر یہ سبق دیا گیا ہے کہ مومن کی پوری زندگی اوقات کے نظام کے ساتھ بندھی ہوئی ہونی چاہئے۔ عام زندگی میں وقت کی پابندی نہ کرنا بھی اتنا ہی غیر اسلامی ہے جتنا نماز کے معاملہ میں وقت کی پابندی نہ کرنا۔

غلو نہیں

قرآن (النساء ۱۷۱) میں اہل کتاب کے تذکرہ کے ذیل میں یہ حکم دیا گیا ہے کہ تم لوگ اپنے دین میں غلو نہ کرو (لاتغلوا فی دینکم) یہی بات حدیث میں ان الفاظ میں آئی ہے کہ تم لوگ دین میں غلو سے بچو کیوں کہ پچھلی امتیں دین میں غلو کی وجہ سے ہلاک ہوگئیں۔ (ایاکم والغلو فی الدین فانما هلك من كان قبلكم بالغلو فی الدین) مسند احمد بن حنبل ۱/ ۲۱۵

غلو کا مطلب ہے زیادہ ہونا، حد سے تجاوز کرنا ۔ حدیث کے مطابق، ہر قسم کے معاملات میں توسط اور اعتدال کی راہ ہی درست راہ ہے۔ اعتدال یا میانہ روی کا طریقہ ہمیشہ کامیابی کی طرف لے جاتا ہے اور غلو کا طریقہ ہمیشہ نقصان اور ناکامی کی طرف۔ یہ خود فطرت کا قانون ہے۔ اسی لئے عالمی سطح پر اس کا اعتراف کیا گیا ہے۔ انگریزی کا ایک مقولہ ہے کہ زیادتی ہر چیز میں بری ہے:

an excess of everything is bad

غلو کا تعلق ہر معاملہ سے ہے۔ مثلاً عقیدہ میں پختہ ہونا بہت اچھی بات ہے مگر عقیدہ کے کھلے اظہار میں اگر جان کا خطرہ ہو تو ایسی حالت میں اپنی جان بچانے کے لئے اخفا کا حکم دیا گیا۔ نماز اور روزہ، ذکر اور تلاوتِ قرآن، سب مطلوب اعمال ہیں مگر ان کی غیر معتدل کثرت مطلوب نہیں۔ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر بلاشبہ ضروری اعمال میں سے ہیں، لیکن اگر کوئی شخص اس کو تشدد کی حد تک لے جائے تو وہ درست نہ ہوگا۔

یہی معاملہ اخلاقی اصولوں کا بھی ہے۔ مثلاً خود اعتمادی ایک اعلیٰ اخلاقی صفت ہے۔

لیکن خود اعتمادی اگر کسی کو غیر حکیمانہ اقدام تک لے جائے تو وہ پسندیدہ نہ ہو گا۔ عزتِ نفس اور خودداری بلاشبہ پسندیدہ اعمال کی حیثیت رکھتے ہیں۔ لیکن اگر عزتِ نفس کسی کو اس حد تک لے جائے کہ وہ اس کے لئے اپنی غلطی کے اعتراف میں رکاوٹ بن جائے تو وہ بھلائی نہیں رہے گی بلکہ ایک برائی بن جائے گی۔

اسی طرح یہ ایک اچھی صفت ہے کہ آدمی کسی کی مدد نہ لے، وہ کسی کا احسان لینا گوارہ نہ کرے۔ وہ اپنی کفالت آپ کرنا چاہے۔ لیکن کسی کا یہ مزاج اگر اس کے اندر فخر اور بڑائی کا جذبہ پیدا کرنے کا سبب بن جائے تو یہ اس کے حق میں ایک بری عادت ہو گی نہ کہ کوئی اچھی عادت۔

آدمی کی یہ کمزوری ہے کہ کسی چیز میں کوئی امتیازی پہلو دیکھتا ہے تو اس کے بارے میں مبالغہ آمیز تصور قائم کر لیتا ہے۔ وہ اس کا مقام متعین کرنے میں حد سے آگے نکل جاتا ہے اسی کا نام غلو ہے۔ شرک اور شخصیت پرستی کی تمام قسمیں اصلاً اسی غلو کی پیداوار ہیں۔

دین میں غلو یہ ہے کہ دین میں کسی چیز کا جو درجہ ہے، اس کو اس کے واقعی درجہ پر نہ رکھا جائے۔ بلکہ اس کو بڑھا کر زیادہ بڑا درجہ دینے کی کوشش کی جائے۔۔ اللہ اپنے ایک بندے کو باپ کے بغیر پیدا کرے تو کہہ دیا جائے کہ یہ خدا کا بیٹا ہے۔ اللہ کسی کو کوئی بڑا مرتبہ دیدے تو سمجھ لیا جائے کہ وہ کوئی مافوق شخصیت ہے اور بشری غلطیوں سے پاک ہے۔ دنیا کی چمک دمک سے بچنے کی تاکید کی جائے تو اس کو بڑھا چڑھا کر ترک دنیا تک پہنچا دیا جائے زندگی کے کسی پہلو کے بارے میں کچھ احکام دیئے جائیں تو اس میں مبالغہ کر کے اسی کی بنیاد پر ایک پورا دینی فلسفہ بنا دیا جائے۔

اس قسم کی تمام صورتیں جن میں کسی دینی تعلیم کو اس کے واقعی مقام سے بڑھا کر مبالغہ آمیز درجہ دیا جائے تو وہ غلو کی فہرست میں شامل ہو گا۔

حکمتِ نبوی

پیغمبر اسلام ﷺ کی صفات میں سے ایک صفت یہ ہے کہ آپ صاحب حکمت تھے اور لوگوں کو حکیمانہ روش اختیار کرنے کی تلقین فرماتے تھے۔اس سلسلہ میں آپ کے بہت سے اقوال حدیث کی کتابوں میں آئے ہیں۔ مثال کے طور پر آپ نے فرمایا: لاحسد الا فی اثنتین رجل آتاہ اللہ مالا فسلطه علی هلکته فی الحق ،واخر اتاه الله حکمة فهو یقضی بها ویعلمها (فتح الباری ،بشرح صحیح البخاری ١٢٨/١٣)

یعنی حسد نہیں سوا دو قسم کے آدمیوں پر۔ایک وہ آدمی جس کو اللہ نے مال دیا تو وہ اس کو حق کے راستہ میں زیادہ سے زیادہ خرچ کرتا ہے۔اور دوسرا آدمی وہ جس کو اللہ نے حکمت دی تو وہ اس کے مطابق فیصلہ کرتا ہے اور اس کی تعلیم دیتا ہے۔

حضرت عبداللہ بن عباس کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے مجھے اپنے سینے سے لگایا اور کہا کہ اے اللہ اس کو حکمت عطا فرما (ضمنی النبی ﷺ الی صدره وقال الهم علمه الحکمة)فتح الباری ١٢٦/٧

اسی طرح اور بہت سی روایتیں ہیں جن سے حکمت کی اہمیت کا اندازہ ہوتا ہے۔ مثلاً رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: نعم المجلس مجلس ینشر فیه الحکمة (الدارمی مقدمه) یعنی کیا ہی اچھی ہے وہ مجلس جس میں حکمت کی بات کی جائے۔اسی طرح آپ نے فرمایا کہ **لیس هدیة افضل من کلمة حکمة (الدارمی ، مقدمه)** یعنی حکمت کی بات سے زیادہ افضل کوئی تحفہ نہیں۔

حکمت کی اہمیت اتنی زیادہ ہے کہ اس کی بابت یہ تعلیم دی گئی کہ دوسری قوموں میں

اگر کوئی حکمت کی چیز ملے تو اس کو لینے سے بھی دریغ نہیں کرنا چاہئے۔ چنانچہ آپ نے فرمایا: الکلمة الحکمة ضالة المومن حیث وجدها فهواحق بها (الترمذی، کتاب العلم) یعنی حکمت کی بات مومن کا گم شدہ سرمایہ ہے وہ جہاں اس کو پائے تو وہی اس کا زیادہ حق دار ہے۔

بعض روایت کے مطابق، حکمت اور تفقہ کی اہمیت عبادت سے بھی زیادہ ہے۔ چنانچہ الترمذی اور ابن ماجہ میں روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: فقیہ واحد اشد علی الشیطان من الف عابد (مشکاۃ المصابیح ۱/۷۵) یعنی ایک فقیہ، شیطان کے اوپر ہزار عابدوں سے بھی زیادہ بھاری ہے۔

پیغمبر اسلام ﷺ کی پوری زندگی حکمت کی مثالوں سے بھری ہوئی ہے۔ نبوت کی ذمہ داریوں کو ادا کرنے کے لئے آپ نے ہر موقع پر اور ہر مرحلہ میں حکمت کا طریقہ اختیار فرمایا۔ یہاں اس سلسلہ میں آپ کی زندگی سے چند مثالیں نقل کی جاتی ہیں۔

نزاع کے موقع پر

پیغمبر اسلام ﷺ کی عمر جب ۳۵ سال تھی اس وقت مکہ میں ایک واقعہ پیش آیا۔ کعبہ کی عمارت بعض اسباب سے منہدم ہو گئی۔ اس کے بعد قریش کے لوگوں نے اس کی نئی تعمیر کی۔ اس دوران یہ مسئلہ پیدا ہوا کہ حجر اسود کو کون اٹھائے اور اس کو دوبارہ اس کی جگہ پر کعبہ کی دیوار میں نصب کرے۔ یہ چونکہ فضیلت کا ایک معاملہ تھا، ہر ایک یہ چاہنے لگا کہ وہی اس کو اٹھا کر نصب کرے اور اس شرف کا مالک بنے۔

اس سوال پر قریش کے لوگوں میں کئی دن تک جھگڑا جاری رہا اور کوئی اتفاقی فارمولا طے نہ ہو سکا آخر کار قریش کے ایک بزرگ کی تجویز کے مطابق وہ اس پر راضی ہوئے کہ

کل صبح کو جو آدمی سب سے پہلے کعبہ میں داخل ہو، وہی اس مسئلہ کا فیصلہ کرے اور تمام لوگ اس کے فیصلہ کو مان لیں۔ اگلی صبح کو جب لوگ دوبارہ کعبہ میں آئے تو انھوں نے دیکھا کہ کعبہ میں داخل ہونے والے سب سے پہلے شخص رسول اللہ ﷺ ہیں۔ ہر ایک نے بیک زبان کہا: هذا الامين رضينا هذا محمد (سیرت ابن ہشام ۱/۲۱۴) یعنی یہ تو محمد الامین ہیں، ہم ان کے فیصلہ پر راضی ہیں۔

رسول اللہ نے لوگوں سے کہا کہ ایک چادر لے آؤ۔ وہ لوگ چادر لائے تو آپ نے اس کو زمین پر پھیلایا اور حجر اسود کو اٹھا کر اس کے اوپر رکھ دیا۔ پھر آپ نے لوگوں سے کہا کہ تم سب لوگ چادر کے کناروں کو پکڑو اور اس کو اٹھا کر کعبہ کی دیوار کے پاس لے چلو۔ انھوں نے ایسا ہی کیا۔ پھر آپ نے حجر اسود کو چادر سے اٹھایا اور اس کو کعبہ کی دیوار میں نصب کر دیا۔

پیغمبر اسلام ﷺ کا یہ عمل ایک بہترین نمونہ ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ کسی نزاعی معاملہ کو کس طرح خوش اسلوبی کے ساتھ طے کیا جاسکتا ہے۔ وہ یہ کہ حکیمانہ انداز اختیار کرتے ہوئے ہر ایک کو اس میں شریک کرلیا جائے۔ اس طرح کا معاملہ لوگوں کے لئے اکثر وقار کا سوال بن جاتا ہے۔ اگر حسن تدبیر سے لوگوں کو یہ احساس دلایا جائے کہ ان کا وقار محفوظ ہے تو مسئلہ کو حل کرنے میں کوئی دشواری نہ ہوگی۔

آغاز کار

پیغمبر اسلام ﷺ کو جب مکہ میں نبوت ملی تو آپ نے اپنے عمل کا یہ طریقہ اختیار فرمایا کہ آپ لوگوں کے پاس جاتے اور ان سے کہتے کہ اے لوگو، کہو کہ ایک اللہ کے سوا اور کوئی معبود نہیں، تم فلاح پاؤ گے (ایها الناس قولوا لا اله الا الله تفلحوا) یعنی تم لوگ شرک کو

چھوڑدو اور ایک خدا کی پرستش کا طریقہ اختیار کرو، تم فلاح پاؤ گے۔

اس وقت کعبہ میں ۳۶۰ بت رکھے ہوئے تھے۔ اب ایک صورت یہ تھی کہ کعبہ کو بتوں سے پاک کر کے اس کو توحید کے مرکز کے طور پر بنایا جاتا۔ مگر اس وقت وہ عملاً شرک وبت پرستی کا مرکز بن گیا تھا۔ ان حالات میں رسول اللہ ﷺ کے سامنے دو مختلف راستے تھے۔ ایک یہ کہ کعبہ سے بتوں کو نکال کر وہاں دوبارہ توحید کا ماحول قائم کریں اور اس کو مرکز بنا کر اپنی موحدانہ تحریک چلائیں۔

ایک صورت قولی دعوت سے آغاز کرنے کی تھی۔ اور دوسری صورت عملی اقدام سے آغاز کرنے کی۔ جیسا کہ تاریخ سے ثابت ہے، آپ نے عملی اقدام سے مکمل طور پر پرہیز کیا، اور صرف قولی دعوت کے نہج پر مکہ میں اپنا پیغمبرانہ مشن جاری فرمایا۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اسلامی دعوت یا اسلامی تحریک کا صحیح پیغمبرانہ طریقہ کیا ہے۔ وہ یہ ہے کہ پہلے پرامن فکری مہم کے ذریعہ لوگوں کی سوچ اور کردار میں تبدیلی لائی جائے۔ یہ ابتدائی کام جب قابل لحاظ حد تک انجام پا جائے، اس کے بعد حسب حالات عملی اقدام کا آغاز کیا جائے۔

توہین کو برداشت کرنا

مشہور سیرت نگار ابن اسحٰق بتاتے ہیں کہ قریش نے رسول اللہ ﷺ کا نام مذمم رکھا تھا۔ پھر وہ آپ کا سب وشتم کرتے تھے۔ اس کے جواب میں رسول اللہ ﷺ اپنے ساتھیوں سے فرماتے تھے کہ کیا تم کو اس پر تعجب نہیں کہ اللہ نے کس طرح مجھ کو قریش کی ایذا رسانی سے بچالیا۔ وہ سب وشتم کرتے ہیں اور ایک مذمم شخص کی ہجو کرتے ہیں اور میں محمد ہوں۔

وكانت قريش انما تسمى رسول الله ﷺ مذمما ثم يسبونه فكان رسول الله ﷺ يقول: "الا تعجبون لما صرف الله عني من اذى قريش يسبون ويهجون مذمما وانا محمد" (سيرت ابن هشان ١/ ٣٧٩)

پیغمبر اسلام ﷺ کا اصل نام محمد تھا جس کا مطلب ہے تعریف کیا ہوا۔ مکی دور میں جب قریش کو آپ کے ساتھ عناد پیدا ہوا تو انھیں پسند نہیں آیا کہ وہ آپؐ کو محمد (تعریف کیا ہوا) جیسے نام سے پکاریں۔ انھوں نے اپنے جذبہ عناد کی تسکین کے لئے بطور خود آپ کا نام مذمم رکھ دیا جس کے معنی ہیں مذمت کیا ہوا۔ قریش جب آپ کو برا بھلا کہتے تو وہ آپ کے لئے محمد کا لفظ استعمال نہ کرتے بلکہ وہ مذمم کا لفظ بول کر آپ کو برا بتاتے۔ حتیٰ کہ ابولہب کی بیوی ام جمیل نے خود آپ کے سامنے آکر کہا: **مذمما عصینا** (صفحہ ۳۷۹) یعنی یہ مذمم ہیں اور ہم ان کو نہیں مانتے۔

یہ بلا شبہ ایک اشتعال انگیزی تھی اور آپ کی توہین بھی۔ لیکن پیغمبر اسلام نے ایک خوبصورت جواب دے کر اس کو نظر انداز کر دیا۔ آپ نے فرمایا کہ یہ لوگ مذمم کی سبّ وشتم کرتے ہیں۔ مگر ان کی سبّ وشتم میرے اوپر پڑنے والی نہیں کیوں کہ میرا نام محمد ہے نہ کہ مذمم۔

پیغمبر اسلام ﷺ ہجرت کر کے مدینہ آئے تو یہاں عبداللہ بن ابی آپ کا شدید مخالف بن گیا۔ اس نے اگرچہ اسلام قبول کر لیا تھا مگر حسد کے جذبہ کے تحت وہ آپ کا شدید مخالف بن گیا۔ آپ کی توہین کرنا، آپ کا سبّ وشتم کرنا اور آپ کے خلاف بری باتیں پھیلانا اس کا سب سے بڑا مشغلہ بن گیا۔ یہ کہنا صحیح ہوگا کہ وہ سب سے بڑا شاتم رسول تھا۔ حضرت عمر فاروق نے رسول اللہ ﷺ سے کہا کہ مجھے اجازت دیجئے کہ میں اس کو قتل

کردوں۔ آپ نے فرمایا: دعه لا یتحدث الناس ان محمدا یقتل اصحابه.(فتح الباری ۸/ ۵۲۰) یعنی اس کو چھوڑ دو۔ لوگ یہ نہ کہیں کہ محمد اپنے ساتھیوں کو قتل کرتے ہیں۔

اس واقعہ سے پیغمبر اسلام ﷺ کا ایک خاص اسوہ معلوم ہوتا ہے۔ وہ یہ کہ...... توہین کو برداشت کرلو۔ کیونکہ اگر تم نے توہین کو برداشت نہ کیا تو اس سے بھی زیادہ بڑی برائی سامنے آئے گی، اور وہ خدا کے دین کی بدنامی ہے۔

قبل از وقت اقدام نہیں

پیغمبر اسلام ﷺ تقریباً ۱۳ سال تک مکہ میں رہے یہاں کی اکثریت آپ کی مخالف بنی رہی۔ انھوں نے ہر طرح آپ کو ستایا۔ تاہم آپ کے دعوتی جدوجہد کے نتیجہ میں وہاں کے تقریباً دو سو مرد اور عورت اسلام میں داخل ہوگئے۔ یہ لوگ بار بار آپ سے یہ کہتے کہ ہم ظلم کے خلاف جہاد کریں گے۔ مگر آپ ہمیشہ انھیں صبر کی تلقین کرتے رہے۔ مثلاً حضرت عمر فاروق نے قریش کے مظالم کے خلاف جہاد کی اجازت مانگی تو آپ نے فرمایا: یا عمر انا قلیل(سیرت ابن کثیر ۱/ ٤٤١) یعنی اے عمر ہم تھوڑے ہیں۔

مکی دور کے آخر میں مدینہ کے تقریباً دو سو آدمی اسلام میں داخل ہوگئے۔ ان لوگوں کو جب معلوم ہوا کہ مکہ کے لوگ آپ کو اور آپ کے اصحاب کو ظلم وزیادتی کا نشانہ بنا رہے ہیں تو انھوں نے بھی کہا کہ ہم کو ان ظالموں کے خلاف لڑنے کی اجازت دیجئے مگر ان سے بھی آپ نے یہی فرمایا کہ صبر کرو کیوں کہ مجھے قتال کی اجازت نہیں دی گئی۔ (اصبروا فانی لم اومر بالقتال)

پیغمبر اسلام ﷺ نے ہر قسم کے ظلم وزیادتی کے باوجود تقریباً ۱۵ سال تک یکطرفہ

طور پر صبر و برداشت کا طریقہ اختیار کیا۔ اس کے بعد پہلی بار آپ غزوۂ بدر کے موقعہ پر اپنے اصحاب کو لیکر دشمنوں سے مقابلے کے لئے نکلے۔ یہ بھی آپ نے اس وقت کیا جب کہ اللہ تعالی کی طرف سے یہ کھلا وعدہ آگیا کہ آسمان سے فرشتے تمہاری مدد کے لئے آئیں گے۔ (الانفال ۹)

پیغمبر اسلام ﷺ کا طریقہ یہ نہیں کہ جب بھی کوئی ظلم کرے تو فوراً اس کے خلاف کارروائی شروع کردی جائے۔ آپ کی سنت یہ ہے کہ ظلم کے باوجود صبر واعراض کا طریقہ اختیار کیا جائے۔ عملی اقدام صرف اس وقت کیا جائے جب کہ اس کا نتیجہ خیز ہونا یقینی بن گیا ہو۔

مقام نزاع سے ہٹ جانا

پیغمبر اسلام ﷺ نبوت کے بعد تقریباً ۱۳ سال تک مکہ میں رہے۔ کچھ لوگوں نے آپ کا ساتھ دیا مگر مکہ کی اکثریت آپ کی شدید مخالف بنی رہی۔ جب انھوں نے دیکھا کہ صرف مخالفت آپ کے مشن کو ختم کرنے کے لئے کافی نہیں تو وہ پیغمبر اسلام ﷺ کے قتل کے درپے ہو گئے۔ انھوں نے طے کیا کہ مکہ کے تمام سردار بیک وقت حملہ کر کے آپ کو قتل کردیں۔ تاکہ آپ کی تحریک توحید کا خاتمہ ہو جائے۔

یہ ایک نازک موقع تھا۔ بظاہر ایک صورت یہ تھی کہ آپ اپنے ساتھیوں کو لیکر ان سے مقابلہ کریں۔ مگر آپ نے اس معاملہ کو نتیجہ کے اعتبار سے دیکھا چونکہ اس وقت کے حالات میں مسلح مقابلہ غیر مفید ہوتا اس لئے آپ نے اعراض کے اصول پر عمل فرمایا اور مکہ سے ہجرت کر کے مدینہ چلے گئے۔

پیغمبر اسلام ﷺ کی سنت نزاع سے ٹکرانا نہیں ہے بلکہ نزاع کے مقام سے ہٹ جانا

ہے۔ اس طرح آدمی کو یہ موقع مل جاتا ہے کہ وہ اپنی قوتوں کو بچا کر انھیں زیادہ مفید طور پر استعمال کر سکے۔

اغیار کی رعایت

اسلام میں ایک مستقل اصول وہ ہے جس کو قرآن میں تالیف قلب کہا گیا ہے۔ (التوبہ ۶۰) تالیف قلب کا مطلب ہے دلوں کو جوڑنا، لوگوں کو اپنے سے مانوس کرنا۔ یہ مقصد صرف اس طرح حاصل کیا جاسکتا ہے کہ دوسروں کی رعایت کی جائے۔ دوسروں کے جذبات اور مفادات کا احترام کیا جائے۔ تالیف کا یہ اصول اسلامی دعوت کا ایک اہم اصول ہے۔ وہ ابدی طور پر ہر انسانی سماج میں مطلوب ہے۔

پیغمبر اسلام ﷺ نے اپنی پوری زندگی میں تالیف قلب کے اس اصول پر عمل فرمایا۔ مثلاً جب آپ ہجرت کر کے مدینہ آئے تو اس وقت وہاں اہلِ ایمان کے ساتھ مشرکین اور یہود بھی آباد تھے۔ اس وقت آپ نے اپنی طرف سے ایک منشور جاری فرمایا جس کو عام طور پر صحیفہ مدینہ کہا جاتا ہے۔ اس میں آپ نے اعلان فرمایا کہ ہر گروہ کو اپنے مذہب اور کلچر کی آزادی ہوگی۔ ہر قبیلہ کے نزاعی معاملات اس کی اپنی قبائلی روایات کے تحت طے کیے جائیں گے۔ عقیدہ اور کلچر کے معاملہ میں کسی کو مجبور نہیں کیا جائے گا۔

یہود کے ساتھ آپ نے خصوصی رعایت کا معاملہ فرمایا، رمضان کے روزہ کی فرضیت سے پہلے آپ بھی انھیں دنوں میں روزہ رکھتے رہے جب کہ یہود روزہ رکھتے تھے۔ تحویلِ قبلہ کا حکم آنے سے پہلے تقریباً سترہ مہینہ تک آپ نے یہود کے قبلہ (بیت المقدِس) کو اپنا قبلہ بنائے رکھا۔ یہود کے قبلۂ عبادت کو اپنا قبلہ بنانا اس لئے تھا کہ آپ امید رکھتے تھے کہ اس طرح وہاں کے یہود آپ سے مانوس ہوں گے اور آپ کے قریب

آجائیں گے۔ (تفسیر القرطبی ۲/۱۵۰)

پیغمبر اسلام ﷺ کا طریقہ مخالفت کے جواب میں مخالفت نہ تھا۔ بلکہ مخالفت کے جواب میں رعایت تھا۔ آپ کی سوچ یہ نہیں تھی کہ لوگوں کو دبا کر انھیں اپنا تابع بنائیں۔ اس کے برعکس آپ کا طریقہ یہ تھا کہ لوگوں کے ساتھ شفقت اور رعایت کا معاملہ کیا جائے، ان کے دل کو نرم کر کے انھیں اپنا ساتھی بنایا جائے۔

رازداری

فتح مکہ کے واقعات کے ذیل میں آیا ہے کہ مدینہ میں آپ نے سفر کے لئے تیاری کا حکم دیا۔ عام مسلمان ضروری تیاری میں مصروف ہو گئے۔ اس زمانے میں حضرت ابو بکر صدیق اپنی صاحبزادی عائشہ کے گھر میں آئے جو پیغمبر اسلام ﷺ کی اہلیہ تھیں۔ وہ اس وقت ضروری تیاری کر رہی تھیں۔ حضرت ابو بکر صدیق نے اپنی صاحبزادی سے پوچھا کہ کیا رسول اللہ ﷺ نے تم کو اس کا حکم دیا ہے۔ حضرت عائشہ نے کہا کہ ہاں۔ حضرت ابو بکر صدیق نے دوبارہ پوچھا کہ یہ تیاری کہاں کے سفر کے لئے ہے۔ حضرت عائشہ نے جواب دیا کہ خدا کی قسم مجھ کو نہیں معلوم (واللہ ما ادری) سیرت ابن ہشام ۴/۱۴)

پیغمبر اسلام ﷺ کی سنتوں میں سے ایک سنت یہ تھی کہ آپ نازک معاملات میں ہمیشہ رازداری کا طریقہ اختیار فرماتے تھے۔۔ یہی آپ نے فتح مکہ کی مہم میں کیا۔ مدینہ سے آپ اپنے دس ہزار اصحاب کے ساتھ نکلے مگر آپ نے لوگوں کو یہ نہیں بتایا کہ ہم کہاں جا رہے ہیں۔ صحابہ کہتے ہیں کہ ہم چلتے ہوئے اس مقام پر پہنچے جہاں سے راستہ سیدھا مکہ کی طرف جاتا تھا، اس وقت ہم نے جانا کہ یہ سفر مکہ کے لئے ہے۔

نازک اجتماعی معاملات میں رازداری بے حد اہم ہے اکثر اوقات کامیابی کا انحصار اس

پر ہوتا ہے کہ فریق ثانی کو آپ کے منصوبہ کا پیشگی علم نہ ہوسکے۔ پیغمبر اسلام ﷺ نے اس حکمت کو نہایت اہتمام کے ساتھ اپنی زندگی میں اختیار فرمایا۔

صورت موجودہ کو مان لینا

جب بھی دو آدمیوں یا دو گروہوں میں نزاع پیدا ہو تو بالآخر دونوں کے درمیان ایک عملی حالت قائم ہو جاتی ہے۔ جس کو اسٹیٹس کو (Status quo) کہا جاتا ہے۔اس اسٹیٹس کو کو بدلنے کی کوشش اکثر حالات میں بے نتیجہ ہوتی ہے۔ کیونکہ فریق ثانی اپنی پوری طاقت کے ساتھ جوابی کارروائی کرتا ہے۔اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ صورت موجودہ(اسٹیٹس کو) بدستور باقی رہتی ہے۔مزید نقصان یہ ہوتا ہے کہ اس بے نتیجہ کوشش میں طرفین کے حاصل شدہ مواقع بھی بے فائدہ طور پر ضائع ہو جاتے ہیں۔

اس طرح کے نزاعی معاملہ میں پیغمبر اسلام کی سنت یہ ہے کہ موجودہ حالت (اسٹیٹس کو) کو مان لو۔اس اسٹیٹس کو ازم کا یہ عظیم فائدہ ہوتا ہے کہ آپ کو یہ فرصت مل جاتی ہے کہ اپنی قوتوں کو مزید استحکام میں لگا دیں۔ مقام نزاع سے ہٹ کر اپنے آپ کو اتنا مضبوط بنائیں کہ آخر کار طاقت کا توازن بدل جائے اور کسی بڑے ٹکراؤ کے بغیر معاملہ کا فیصلہ کیا جاسکے۔

پیغمبر اسلام ﷺ نے حدیبیہ کے موقع پر یہی حکمت اختیار فرمائی۔ آپ مدینہ سے روانہ ہو کر حدیبیہ کے مقام پر پہنچے تو مکہ کے لوگ بھی چل کر وہاں آ گئے۔انھوں نے کہا کہ ہم آپ کو آگے جانے نہیں دیں گے۔اس طرح حدیبیہ کے مقام پر ایک تعطل کی حالت پیدا ہو گئی۔ پیغمبر اسلام ﷺ نے ایسا نہیں کیا کہ اس تعطل کو توڑ کر آگے بڑھنے کی کوشش کریں بلکہ آپ حدیبیہ ہی سے دوبارہ مدینہ واپس آ گئے۔

یہ گویا اپنے اور فریق ثانی کے درمیان قائم شدہ اسٹیٹس کو کو مان لینا تھا۔ اس حکمت کا نتیجہ یہ ہوا کہ پیغمبر اسلام کو یہ موقع مل گیا کہ وہ اپنے آپ کو مزید مستحکم کر سکیں۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا اور صرف دو سال کے اندر آپ کے لئے مکہ میں فاتحانہ داخلہ ممکن ہو گیا۔

مشکل میں آسانی

پیغمبر اسلام ﷺ نے ۸ھ میں مکہ فتح کیا۔ اس کے بعد آپ اپنے اصحاب کے ساتھ مکہ سے طائف کے لئے روانہ ہوئے۔ اس زمانہ میں عرب میں ہموار سڑکیں نہیں تھیں۔ چلتے ہوئے ایک جگہ ایک تنگ راستہ آیا جو دو پہاڑیوں کے درمیان سے گذرتا تھا۔ چنانچہ یہ راستہ اپنی اسی صفت کے ساتھ مشہور ہو گیا تھا۔

پیغمبر اسلام ﷺ جب اس جگہ پہنچے تو آپ نے لوگوں سے پوچھا کہ اس راستہ کا نام کیا ہے (**ما اسم هذه الطريق**) لوگوں نے جواب دیا کہ اس کا نام تنگ راستہ ہے (**فقيل له الضيقة**) آپ نے جواب دیا کہ نہیں، یہ ایک آسان راستہ ہے (**فقال بل هي اليسرى**) سیرت ابن ہشام ۴/۱۲۷)

اس وقت پیغمبر اسلام ﷺ کے ساتھ دس ہزار سے زیادہ آدمی تھے۔ یہ لوگ اگر افقی انداز میں پھیل کر چلتے تو یقیناً ان کے لئے اس راستہ سے گذرنا مشکل ہوتا، ایسی حالت میں وہ ان کے لئے تنگ بن جاتا۔ لیکن یہی لوگ اگر قطار بنا کر چلیں تو ان کے لئے راستہ سے گذرنا مشکل نہ رہے گا، اور وہ بظاہر تنگی کے باوجود ان کے لئے عملی طور پر آسان ہو جائے گا۔ پیغمبر اسلام ﷺ نے اپنے جواب میں اسی عملی حکمت کی طرف اشارہ فرمایا۔

پیغمبر اسلام ﷺ کے اس واقعہ سے زندگی کا ایک اہم راز معلوم ہوتا ہے۔ اور وہ حسب حالت تدبیر ہے۔ اس حکیمانہ تدبیر کا تعلق زندگی کے تمام معاملات سے ہے۔ اس

تدبیر کو استعمال کر کے زندگی کی ہر مشکل کو آسان بنایا جا سکتا ہے۔

تدبیری پسپائی

پیغمبر اسلام ﷺ کے زمانے میں ۸ھ میں ایک جنگ ہوئی۔ یہ شام کی سرحد پر مؤتہ کے مقام پر ہوئی اسی نسبت سے اس کو جنگ مؤتہ کہا جاتا ہے۔ اس جنگ کے موقع پر مسلمانوں کی تعداد صرف تین ہزار تھی۔ اس کے مقابلہ میں فریق ثانی کی فوجی تعداد غیر متناسب طور پر بہت زیادہ تھی۔ آخری مرحلہ میں خالد بن الولید اس کے سردار مقرر ہوئے انھوں نے لڑائی کو غیر مفید سمجھ کر واپسی کا فیصلہ کیا۔ وہ تدبیری پسپائی (Tactical retreat) کے اصول پر مؤتہ سے واپس ہو کر مدینہ چلے گئے۔

عربوں کا مزاج لڑنے مرنے کا مزاج تھا۔ وہ اس پسپائی کی حکمت کو سمجھ نہ سکے۔ چنانچہ جب وہ مدینہ پہنچے تو وہاں کے نوجوانوں نے یا فرّار کہہ کر ان کا استقبال کیا۔ یعنی اے بھاگنے والو۔ پیغمبر اسلام ﷺ نے اس کو سنا تو آپ نے اس کی تردید فرمائی۔ آپ نے کہا کہ یہ لوگ بھاگنے والے نہیں ہیں بلکہ خدا نے چاہا تو وہ اقدام کرنے والے ہیں۔ (لیسوا بالفرار ولکنهم الکرار انشاء الله تعالی) (سیرت ابن ہشام ۴۳۸/۳)

پیغمبر اسلام ﷺ کے اس ارشاد سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ کے نزدیک صحیح اقدام وہ ہے جو نتیجہ خیز ثابت ہو سکے۔ محض جوش اور وقار کے لئے لڑ کر مر جانا کوئی مطلوب اسلامی کام نہیں۔ اگر اہل ایمان کے مقابلے میں فریق ثانی کی طاقت فیصلہ کن حد تک زیادہ ہو تو ایسی حالت میں مقابلہ کے لئے اقدام نہیں کیا جائے گا۔ حتی کہ اگر مقابلہ پیش آجائے تو تدبیری پسپائی اختیار کی جائے گی۔ تاکہ مزید تیاری کر کے اپنے آپ کو نتیجہ خیز اقدام کے قابل بنایا جا سکے۔

اصلاح میں تدریج

ایک روایت کے مطابق، حضرت عائشہ نے فرمایا کہ قرآن میں سب سے پہلے وہ آیتیں اور سورتیں نازل ہوئیں جن میں جنت کا اور جہنم کا ذکر تھا۔ یہاں تک کہ جب لوگ اسلام کی طرف مائل ہو گئے تو اس کے بعد حلال و حرام کے احکام اترے۔ اور اگر ایسا ہوتا کہ شروع ہی میں یہ حکم اترتا کہ تم لوگ شراب نہ پیو تو یقیناً لوگ کہتے کہ ہم شراب کبھی نہیں چھوڑیں گے۔ اسی طرح اگر شروع ہی میں یہ حکم اترتا کہ زنا نہ کرو تو لوگ کہتے کہ ہم کبھی زنا نہیں چھوڑیں گے۔ (صحیح البخاری، کتاب فضائل القرآن، باب تالیف القرآن، بحوالہ فتح الباری، ۶۵۵/۸)

اس روایت سے ایک عظیم حکمت نبوی معلوم ہوتی ہے۔ یہ وہی عملی حکمت ہے جس کو تدریج (Graduation) کہا جاتا ہے۔ انسان کی اصلاح ایک مشکل اور پیچیدہ کام ہے۔ انسان عام طور پر کچھ خیالات اور عادات سے مانوس ہو جاتے ہیں۔ وہ اسی کو درست سمجھنے لگتے ہیں۔ اس بنا پر وہ کسی نئی چیز کو فوری طور پر قبول کرنے کے لئے تیار نہیں ہوتے۔ ایسی حالت میں انسانوں کی اصلاح کا واحد طریقہ یہ ہے کہ اس کام کو حکمت اور تدریج کے ساتھ کیا جائے۔

رسول اللہ ﷺ نے عرب میں پہلے لوگوں کی سوچ کو بدلا۔ لوگوں کے اندر قبولیت کا مزاج پیدا کیا۔ یہاں تک کہ جب ان کے اندر اصلاح کو قبول کرنے کی استعداد پیدا ہو گئی تو اس کے بعد آپ نے شرعی احکام کا نفاذ فرمایا۔ اگر آپ فکری تطہیر اور مزاج سازی کے بغیر شریعت کے قوانین نافذ کرتے تو یہ انسانی فطرت کے خلاف ہوتا، اور وہ انقلابی نتیجہ برآمد نہ ہوتا جو عرب کے سماج میں برآمد ہوا۔

عملی حالات کی رعایت

پیغمبر اسلام ﷺ نے ذی الحجہ ۹ھ میں حج کا فریضہ ادا فرمایا۔ اس کو عام طور پر حجۃ الوداع کہا جاتا ہے۔ اس موقع پر ایک لاکھ سے زیادہ مسلمان اکٹھا تھے۔ آپ نے اپنے خطبہ میں جو باتیں فرمائیں ان میں سے ایک وہ تھی جس کو انسانی مساوات کا اعلان کہا جا سکتا ہے۔ آپ نے اس موقع پر یہ تاریخی الفاظ فرمائے کہ کسی عربی کو کسی عجمی پر فضیلت نہیں، کسی سفید فام کو کسی سیاہ فام پر فضیلت نہیں۔ فضیلت کا تعلق صرف دین اور تقوی سے ہے۔

اس خطبہ کے تقریباً ڈھائی ماہ بعد مدینہ میں آپ کی وفات ہو گئی۔ آپ کی وفات کے بعد یہ مسئلہ پیدا ہوا کہ کس کو خلیفہ بنایا جائے۔ مذکورہ اعلان کے مطابق بظاہر صرف یہ ہونا چاہئے تھا کہ دین اور تقوی کی بنیاد پر خلافت کا فیصلہ کیا جائے نہ کہ نسل اور قبیلہ کی بنیاد پر۔ مگر عملاً ایسا نہیں ہوا۔

آپ کی وفات کے بعد مدینہ کی ایک چوپال (ثقیفہ بنی ساعدہ) میں مسلمانوں کا اجتماع ہوا۔ لوگوں کا پہلا رجحان یہ تھا کہ سعد بن عبادہ کو خلیفہ بنایا جائے جو مدینہ کے ایک قبیلہ سے تعلق رکھتے تھے۔ اس وقت حضرت ابو بکر صدیق نے رسول اللہ ﷺ کی یہ حدیث پیش کی کہ الائمۃ من قریش۔ یعنی خلیفہ یا امام قریش سے ہو گا۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ سعد بن عبادہ چونکہ قبیلہ قریش سے نہیں ہیں اس لئے ان کو خلیفہ نہیں بنایا جا سکتا۔ کسی قدر بحث کے بعد آخر کار لوگوں کا اس پر اتفاق ہو گیا کہ قبیلہ قریش ہی کے کسی شخص کو خلیفہ بنایا جائے۔ اس کے مطابق حضرت ابو بکر صدیق خلیفہ اول مقرر ہوئے جو کہ قریش سے تعلق رکھتے تھے۔

بظاہر یہ ایک متضاد بات ہے۔ پھر پیغمبر اسلام ﷺ نے ایسا کیوں فرمایا۔ اس کے

پیچھے ایک عظیم حکمت تھی۔ وہ یہ کہ خلیفہ یا حکمراں کو ایک وسیع انسانی سماج پر احکام کا نفاذ کرنا ہوتا ہے۔ اس کے لئے ضروری ہے کہ لوگ خلیفہ کی اطاعت پر راضی ہو جائیں۔ یہ اطاعت رضاکارانہ ہونا چاہئے۔ جبری اطاعت کے ذریعہ وہ مقصد حاصل نہیں ہو سکتا جو اسلامی خلافت کا مقصود ہے۔

قدیم عرب میں سیکڑوں سال کی تاریخ کے نتیجہ میں قریش کے لوگوں کو سرداری کا درجہ حاصل ہو گیا تھا۔ عوامی نفسیات کسی ایسے شخص کی سیادت کو آسانی کے ساتھ قبول کر لیتی تھی جس کا تعلق قریش کے قبیلہ سے ہو۔ اسی سماجی صورت حال کی بنا پر رسول اللہ ﷺ نے یہ فرمایا کہ الائمۃ من قریش۔ یہ کوئی ابدی حکم نہیں تھا۔ اس کا مطلب صرف یہ تھا کہ کسی قوم میں جس گروہ کو قریش جیسی سیاسی حیثیت حاصل ہو جائے، وہاں اسی گروہ کے کسی فرد کو قوم کے اوپر حاکم بنایا جائے۔

اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ عملیت (Pragmatism) بھی رسول اللہ ﷺ کی سنتوں میں سے ایک سنت ہے۔ انفرادی معاملہ میں ایک شخص کو ہمیشہ نظری معیار سامنے رکھنا چاہئے۔ مگر اجتماعی معاملات میں بعض اوقات نظری معیار قابل عمل نہیں ہوتا، اس لئے ضروری ہوتا ہے کہ ایسے معاملہ میں نظری معیار کو چھوڑ کر عملی تقاضے کے مطابق فیصلہ کیا جائے۔ اگر ایسا نہ کیا جائے تو زندگی کا نظام ہموار طور پر نہیں چل سکتا۔

مستقبل بینی

فتح مکہ کے بعد عرب میں وہ دور آیا جس کو تاریخ میں عام الوفود کہا جاتا ہے۔ عرب کے قبائل مدینہ آکر اسلام قبول کرنے لگے۔ ان میں سے ایک قبیلہ ثقیف بھی تھا جو طائف سے آیا تھا۔ یہ لوگ مدینہ آئے تو انھوں نے ایک انوکھی شرط پیش کر دی۔ انھوں نے کہا کہ

ہم اسلام تو قبول کر لیں گے لیکن ہم نہ زکوٰۃ دیں گے اور نہ جہاد کریں گے۔

یہ ایک نازک مسئلہ تھا۔ عام لوگ اس قسم کے اسلام کو قبول کرنے کے لئے تیار نہ تھے۔ لیکن پیغمبر اسلام ﷺ نے حال سے اوپر اٹھ کر مستقبل کو دیکھا۔ آپ نے اپنی بصیرت کے تحت یہ سمجھا کہ یہ لوگ جب اسلام میں داخل ہو کر مسلم معاشرہ کا جزء بن جائیں گے تو وہ اپنے آپ سب کچھ کرنے لگیں گے۔ چنانچہ آپ نے ان کی شرطوں کو مانتے ہوئے انھیں اسلام میں داخل کر لیا۔ لوگوں کے اشکال کو رفع کرنے کے لئے آپ نے فرمایا کہ جب وہ اسلام قبول کر لیں گے تو اس کے بعد وہ زکوٰۃ بھی دیں گے اور جہاد بھی کریں گے۔ (سیتصدقون ویجاھدون اذا اسلموا) سیرت ابن کثیر ۵۶/۴۔

پیغمبر اسلام ﷺ کے اس اسوہ سے ایک عظیم حکمت معلوم ہوتی ہے۔ یہ حکمت ایک لفظ میں مستقبل بینی ہے۔ انسان کوئی پتھر نہیں ہے جو تاثر کو قبول نہ کرے۔ انسان ایک ایسی مخلوق ہے جو ہمیشہ بدلتا رہتا ہے۔ انسان کے حال پر اس کے مستقبل کو قیاس نہیں کیا جاسکتا۔ آدمی سے معاملہ کرتے ہوئے ہمیشہ اس حقیقت کو سامنے رکھنا چاہئے۔ بوقت معاملہ فوری تبدیلی پر اصرار سے ضد پیدا ہوتی ہے۔ اس کے برعکس اگر وسعت ظرف کا طریقہ اختیار کیا جائے تو اپنے آپ ایسا ہو گا کہ آدمی مستقبل میں عین وہی بن جائے گا جیسا کہ حال میں ہم اس کو دیکھنا چاہتے تھے۔

زیر طبع کتاب مطالعۂ سیرت (صفحات ۲۰۸) کا ایک باب

سوال

آپ نے اپنی ایک کتاب میں لکھا ہے کہ اسلام دور جدید کا خالق ہے۔ یہ کتاب انگریزی میں بھی اس نام سے چھپ چکی ہے۔ Islam creator of the modern age

لیکن میں نے مریم جمیلہ صاحبہ کا ایک تبصرہ پڑھا جس میں وہ لکھتی ہیں کہ اسلام دور جدید کا خالق نہیں ہے بلکہ اسلام دور جدید کا انتخاب ہے:

Islam is not the creator of modern age ,but the option of modern age

یہ بات انھوں نے اپنی کتاب Islam and the west میں لکھی ہے۔ آپ اس کے جواب میں کیا کہتے ہیں (ابرار آئی رفعت، سورت)

جواب

یہ بات درست ہے کہ اسلام دور جدید کا انتخاب (choice) ہے۔ جدید ذہن سائنٹفک مذہب چاہتا ہے، اور ایسا مذہب صرف اسلام ہے۔ مگر اسی کے ساتھ یہ بھی بلاشبہ درست ہے کہ اسلام جدید سائنسی دور کا خالق ہے۔ مریم جمیلہ صاحبہ کو اس معاملہ میں غلط فہمی شاید اس لئے ہوئی کہ انھوں نے یہ سمجھ لیا کہ میں ڈائرکٹ معنوں میں یہ بات کہتا ہوں۔ یعنی ڈائرکٹ طور پر اسلام دور جدید کا خالق ہے۔ مثلاً یہ کہ کار اور ہوائی جہاز کی ٹکنالوجی قرآن نے دی ہے۔ مگر یہ میرا کہنا نہیں۔ جب میں کہتا ہوں کہ اسلام دور جدید کا خالق ہے تو میں اس کو بالواسطہ مفہوم (indirect sense) میں کہتا ہوں۔ اسلام کا مقصد اصلاً شرک کو ختم کرنا اور توحید کو قائم کرنا تھا۔ مگر مشرکانہ ذہن کا خاتمہ جدید سائنس کے آغاز کا سبب بن گیا۔ جیسا کہ میں نے اپنی کتاب (اسلام دور جدید کا خالق) میں دکھایا ہے کہ

قدیم زمانہ میں ساری دنیا میں مشرکانہ عقائد کا غلبہ تھا۔ اس مشرکانہ عقیدہ نے نیچر ورشپ پیدا کی اور نیچر ورشپ نیچر کی تحقیق میں رکاوٹ بن گئی۔ اسلامی انقلاب کے ذریعہ اس ذہنی رکاوٹ (mental block) کا خاتمہ ہو گیا۔ اس کے نتیجہ میں تاریخ میں نیچر کی آزادانہ تحقیق کا عمل شروع ہوا جو بالآخر جدید سائنسی انقلاب تک پہنچا۔

سوال

مسلمانوں کا یہ دعوی ہے کہ قرآن خدا کی کتاب ہے۔ جس کی کئی دلیلیں پیش کی جاتی ہیں۔ ان میں سے ایک دلیل یہ ہے کہ چودہ سو سال پہلے قرآن نے جن چیزوں کے بارے میں مجمل اشارے کئے تھے وہ تمام اشارات حالیہ سائنسی انکشافات کے نتیجہ میں صحیح ثابت ہوئے ہیں۔ گویا کہ ثابت شدہ سائنس اور قرآن کے درمیان کوئی تضاد نہیں۔ لیکن دوسری طرف دیگر مذاہب سے متعلق قومیں (یہود و نصاریٰ) بھی اپنی اپنی مقدس کتابوں کے بارے میں یہی دعویٰ کرتی ہیں۔ اور یہ قومیں بھی اپنی کتابوں کے حق میں سائنسی تصدیقات موجود ہونے کا دعویٰ کرتی ہیں۔ دریافت طلب امر یہ ہے کہ کیا قرآن کے دعوے میں ایسی کوئی وجہ امتیاز ہے جو اس کو دوسرے دعاوی سے الگ کرتی ہو (ابرار رفعت، سورت)

جواب

قدیم آسمانی کتابوں میں اگرچہ تحریف ہوئی ہے اور ان میں انسانی کلام شامل ہو گیا ہے۔ تاہم ان میں اب بھی ایسے کچھ اجزاء موجود ہیں جو خدائی الہام کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ان اجزاء میں ایسی باتیں ہیں جو بعد کو دریافت ہونے والی سائنسی حقیقتوں سے مطابقت رکھتی ہیں۔ مگر اسی کے ساتھ ان میں انسانی کلام کا جو حصہ ملا ہوا ہے اس کا معاملہ اس سے مختلف

ہے۔ اس دوسرے جزء میں واضح طور پر ایسی مثالیں موجود ہیں جن کی تصدیق سائنسی دریافتوں سے نہیں ہوتی۔ اس طرح دوسری مقدس کتابوں میں دونوں قسم کے اجزا پائے جاتے ہیں، مطابق بھی اور غیر مطابق بھی۔ مگر قرآن کی صفت یہ ہے کہ وہ پورا کا پورا محفوظ الہام کی حیثیت رکھتا ہے، وہ انسانی ملاوٹ سے مکمل طور پر پاک ہے اس لئے قرآن پورا کا پورا سائنسی حقیقتوں سے مطابقت رکھتا ہے۔ جو چیز دوسری مقدس کتابوں میں صرف جزئی طور پر پائی جاتی ہے وہ قرآن میں کلی طور پر موجود ہے یہی اس معاملہ میں قرآن کا امتیازی وصف ہے۔ اس معاملہ کی تفصیلی مثالیں راقم الحروف کی کتابوں (مثلاً عظمت قرآن وغیرہ) میں دیکھی جا سکتی ہیں۔

سوال

آج کل ہمارے یہاں یہ ذکر زوروں پر ہے کہ آپ نے وندے ماترم کہنا مسلمانوں کے لئے جائز کر دیا ہے۔ اگر یہ جائز ہو تو اس میں کوئی شک نہیں کہ مسلمانوں کو ہندوؤں کے بہت قریب لا دے گا۔ دشمنی ختم ہونا شروع ہو جائے گی۔ لیکن اگر مسلمان زمین کی وندنا کر سکتا ہے تو پھر ہمالہ، گنگا، سرسوتی، گائے وغیرہ کی وندنا کیوں نہیں کر سکتا۔ اور اگر کر سکتا ہے تو پھر شرک کیا ہے (شاکر وارث۔ مراد آباد)

جواب

وندے ماترم کی شرعی نوعیت کے بارے میں میری رائے وہی ہے جو دوسرے علماء کی رائے ہے۔ اس معاملہ میں جو غلط فہمی پیدا ہوئی اس کی ذمہ داری اردو کی زرد صحافت پر ہے۔ اس موضوع پر میرے آرٹیکل کا عنوان یہ تھا۔۔۔ وندے ماترم: اشو یا نان اشو۔ اردو اخبار والوں نے اس کو بدل کر "وندے ماترم، جائز یا ناجائز" بنا دیا۔ اس بدلے ہوئے عنوان

کی بنا پر لوگوں نے یہ سمجھا کہ میں وندے ماترم کو جائز بتا رہا ہوں۔ حالانکہ اصولی اعتبار سے اس کے جائز ہونے کا کوئی سوال نہیں اور نہ میں نے کبھی ایسا کہا۔ میرا مدعا صرف یہ ہے کہ اس معاملہ کو عوامی احتجاج کا اشونہ بنایا جائے۔ کیونکہ اس طرح کے معاملات میں عوامی احتجاج صرف الٹا نتیجہ پیدا کرتا ہے۔ علماء کا کہنا ہے کہ اسکولوں میں وندے ماترم کو لازمی ٹھہرانا دستور کے خلاف ہے۔ مجھے اس سے اتفاق ہے۔ میں صرف یہ کہتا ہوں کہ دستوری نزاع کا فیصلہ جلسوں اور تقریروں کے اسٹیج پر نہیں ہوتا۔ اس کے فیصلہ کا مقام عدالت ہے۔ اس معاملہ میں ہمیں چاہئے کہ ہم ایک طرف متبادل اسکول قائم کریں اور دوسری طرف اپنی جد وجہد کے لئے عوامی مظاہرہ کے بجائے عدالتی طریقہ اختیار کریں۔ گویا کہ میرا اختلاف نفس مسئلہ کے بارے میں نہیں ہے بلکہ طریق کار کے بارے میں ہے۔ ہندستان جیسے جمہوری ملک میں کسی اقلیت کے لئے مظاہراتی طریقہ ہمیشہ ناکام ہوگا۔ اور عدالتی طریقہ ہمیشہ کامیاب۔ مظاہراتی طریقہ میں فیصلہ کن چیز تعداد ہوتی ہے۔ یہاں اقلیتی گروہ اپنی عددی کمی کی بنا پر کمزور پڑجاتا ہے۔ اس کے برعکس عدالتی طریقہ میں سارا انحصار دلیل پر ہوتا ہے اس لئے جو گروہ حق پر ہو اس کی کامیابی یقینی بن جاتی ہے گویا کہ ایک صورت میں فیصلہ کی بنیاد ہمارے ہاتھ میں ہوتی ہے اور دوسری صورت میں فیصلہ کی بنیاد فریق ثانی کے ہاتھ میں۔ وندے ماترم ابھی تو لازم نہیں ہے۔ لیکن اگر اس کو لازم کیا جائے تو اس کو چیلنج کرنے کی صحیح جگہ عدالت ہے نہ کہ عوامی اسٹیج

سوال

قرآن میں نماز قائم کرنے کا حکم ہے۔ نماز پڑھنے کا نہیں تو موجودہ پڑھی جانے والی نماز کن احکامات کی روشنی میں پڑھی جارہی ہے۔ بعض لوگ کہتے ہیں کہ نماز قائم کرنے کا مطلب نظم و نسق درست کرنا ہے اور یہ کہ سجدہ کا مطلب تعمیل حکم ہے یہ کہاں تک درست ہے (محمد بدرالدین شمیم، ناگپور)

جواب

صلّی کا مطلب نماز پڑھنا نہیں ہے بلکہ نماز ادا کرنا ہے۔ اسی طرح اقام کا مطلب نافذ کرنا نہیں ہے بلکہ حسن وخوبی کے ساتھ انجام دینا ہے۔ اس طرح اقام کا مطلب بھی وہی ہے جو صلی کا مطلب ہے۔ البتہ اقام کے لفظ میں اہتمام کے ساتھ ادائیگی کا مفہوم شامل ہو جاتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ ایک غیر علمی اعتراض ہے۔ قرآن میں نماز کا حکم صرف اقام کے لفظ کے ساتھ نہیں آیا ہے بلکہ مختلف الفاظ کے ساتھ آیا ہے۔ مثلاً صلّی، حافظ، وغیرہ۔ ان الفاظ کے لغوی معنی میں تھوڑا تھوڑا فرق ہے۔ مگر سب کا مشترک مفہوم یہ ہے کہ نماز کو پورے اہتمام کے ساتھ ادا کیا جائے۔ قرآن میں اقام کے سوا جن الفاظ کے ساتھ نماز کا حکم آیا ہے ان میں سے کچھ کے حوالے یہ ہیں: القیامۃ ۳۱، العلق ۱۰، الکوثر ۲، المعارج ۲۲، المدثر ۴۳، النساء ۱۰۲، البقرہ ۴۵، البقرہ ۱۵۳ البقرہ ۲۳۸ وغیرہ۔ احادیث میں بار بار نماز کا ذکر لفظ اقامت کے بغیر آیا ہے۔ تاہم صلّ کا مطلب بھی عین وہی ہے جو اقم الصلاۃ کا ہے۔ اقامت کا لفظ دراصل برائے وضاحت ہے۔ اسی طرح قرآن میں دوسرے وضاحتی الفاظ بھی آئے ہیں مثلاً محافظت یا خشوع وغیرہ۔ ان سب کا مطلب یہ ہے کہ نماز کو پوری پابندی کے ساتھ اور ظاہر وباطن کے اعتبار سے اس کے تمام آداب کو ملحوظ رکھتے ہوئے ادا کیا جائے۔ نماز کو اس کے ظاہر اور اس کے باطن دونوں کے اعتبار سے انجام دیا جائے۔ یہی مطلب ہے نماز کی اقامت کا۔ نماز ثابت شدہ طور پر ایک عباداتی فعل ہے۔ اسلام میں نظم ونسق اور احکام کی تعمیل بھی ہے۔ مگر ان چیزوں کا حکم دوسری آیات سے نکلتا ہے نہ کہ نماز کی آیات سے۔ قابل لحاظ بات یہ ہے کہ جن آیتوں میں اقامت کا لفظ آیا ہے وہاں بھی نماز قائم کرنے کا حکم ہے نہ کہ کچھ اور قائم کرنے کا۔ اس لئے ان آیتوں میں بھی

نماز ہی کی اقامت، بالفاظ دیگر نماز کی کامل ادائیگی مراد ہو گی نہ کہ نماز کے سوا کسی اور خود ساختہ چیز کی اقامت یا ادائیگی۔

سوال

ہمارے علمی حلقہ کے ایک دوست کا اصرار ہے کہ آپ سے ایک سوال معلوم کیا جائے۔ وہ یہ کہ ان کے ایک دوست جو کبھی آپ کے بہت قریب رہا کرتے تھے۔ کسی وقت ان کا آپ کے بیت الخلا میں جانے کا اتفاق ہوا اور انھوں نے آپ کے بیت الخلا میں بخاری شریف کو رکھا ہوا دیکھا۔ ایسے مقام پر بخاری شریف کا پایا جانا ان کے لئے نفرت کا سبب بن گیا۔ اور وہ آپ سے دوری اختیار کر گئے۔ اور ہمارے علمی حلقہ میں سبھی اس تعلق سے وضاحت چاہتے ہیں کہ آیا یہ ایک حقیقت ہے یا پھر آپ کی دشمنی میں ایک غلط بات اڑا دی گئی ہے (محسن احمد، حیدر آباد)

جواب

یہ صحیح ہے کہ میرے مطالعہ کے کمرہ سے ملحق باتھ روم میں ایک الماری پر کچھ جلدیں رکھی ہوئی ہیں۔ مگر یہ جلدیں صحیح البخاری کی نہیں ہیں بلکہ وہ اخبار کی جلدیں ہیں۔ اور جدید طرز کے ایک صاف ستھرے باتھ روم کی ایک الماری میں کسی اخبار کی جلدیں رکھنے میں یقینی طور پر کوئی حرج نہیں۔ صحیح البخاری میں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ: ایا کم الظن فان الظن اکذب الحدیث) فتح الاری بشرح النووی ۴۹۶/۱۰) یعنی تم لوگ گمان سے بچو کیوں کہ گمان سب سے بڑا جھوٹ ہے۔ آپ کے دوست نے خود صحیح البخاری کی اس روایت پر عمل نہیں کیا۔ انھیں چاہئے تھا کہ باتھ روم میں رکھی ہوئی جلد کو کھول کر دیکھتے یا مجھ سے اس کی بابت پوچھتے۔ ایسا نہ کر کے انھوں نے صرف گمان کی بنیاد پر

ایک بے بنیاد رائے قائم کی اور اس کو پھیلانا شروع کردیا۔ یہ نہ صرف ایک غیر ذمہ دارانہ فعل ہے بلکہ وہ حدیث کے الفاظ میں ایک قسم کا کذب ہے۔

سوال

الرسالہ اکتوبر ۹۸ صفحہ ۴۳ پر قولی دعوت و فعلی دعوت کے جواب میں آپ نے فعلی دعوت کی نفی کی ہے۔ جب کہ قرآن سے فعلی دعوت ثابت ہے۔ مثال کے طور پر سورہ القلم کی یہ آیت انك لعلى خلق عظيم (محسن احمد، حیدر آباد)

جواب

الرسالہ کی عبارت آپ نے غور سے نہیں پڑھی، ورنہ اس میں پوری بات موجود ہے۔ فعل بلاشبہ مطلوب ہے۔ مگر فعل یا کردار آدمی کی ذاتی ذمہ داری ہے نہ کہ دعوت کی شرط۔ آپ نے قرآن کی جس آیت کا حوالہ دیا ہے اس سے بھی یہی بات ثابت ہوتی ہے۔ مفسر ابن کثیر نے لکھا ہے کہ علماء کا اس پر اتفاق ہے کہ تبلیغ کے لئے عمل شرط نہیں ہے۔ عمل بلاشبہ ایک شخص کی لازمی ذمہ داری ہے اور اس کے ترک پر اس سے یقیناً باز پرس ہوگی۔ مگر یہ کہنا صحیح نہیں کہ دعوت کا کام وہی شخص کر سکتا ہے جو پورے معنوں میں باعمل بن چکا ہو (تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو تفسیر القرآن العظیم لابن کثیر ۱/۸۵)

سوال

دریائے سندھ کے اس پار جو لوگ بستے ہیں ان کو خود مسلم فاتحین نے ہندو کہا تھا۔ اس کے مطابق، ہمارا کہنا ہے کہ بھارت میں بسنے والے تمام لوگ ہندو ہیں۔ خواہ مذہب کے اعتبار سے وہ مسلمان ہوں یا غیر مسلمان۔ پھر آپ لوگ اپنے آپ کو ہندو کہلانے کو کیوں برا مانتے ہیں (نشانت کمار، نئی دہلی)

جواب

ہندستان یا بھارت اس وقت مسلم فاتحین کے زیر حکومت نہیں ہے۔ آزادی کے بعد یہاں کا سیاسی اور سماجی نظام دستور ہند کے تحت چل رہا ہے۔ اس دستور میں اس ملک کے تمام باشندوں کو انڈین بتایا گیا ہے۔ چنانچہ پاسپورٹ وغیرہ میں اس ملک کا ہر رہنے والا اپنے آپ کو انڈین لکھتا ہے۔ ایسی حالت میں یہ کہنا کہ اس ملک کے تمام باشندوں کی نیشنلٹی ہندو ہے دستور کی کھلی خلاف ورزی ہے۔ اگر کچھ لوگ یہ چاہتے ہیں کہ اس ملک کے تمام بسنے والوں کو ہندو کہا جائے تو ان کو سب سے پہلے دستور ہند میں ترمیم کرکے اس کی متعلقہ دفعات کو بدلنا چاہئے۔ موجودہ حالت میں اس قسم کا مطالبہ کرنا دستور ہند کے خلاف ہے، اس لئے کسی کو ایسا کہنے کا حق ہی نہیں۔

سوال

حال ہی میں ہوئے بہار شریف میں فرقہ وارانہ ہندو مسلم فسادات کی خاص وجہ یہ تھی کہ ہندو نے 'درگا' کی مورتی کو لے کر مسلم محلّہ میں آگئے اور اشتعال انگیز نعرہ لگانے لگے۔ کہ مسلمان ہندستان کے غدار ہیں، مسلمان پاکستانی ایجنٹ ہیں، ان کو ہندستان سے مار بھگاؤ۔ اس موقع پر مسلمانوں کو کیا کرنا چاہئے تھا (شاہ فیصل، ویاؤ نالندہ)

جواب

اس سوال کا جواب پیشگی طور پر خلیفۂ ثانی حضرت عمر فاروق نے دے دیا ہے۔ وہ انھیں کے الفاظ میں یہ ہے: امیتو ا الباطل بالصمت عنه (باطل کو ہلاک کرو اس سے چپ رہ کر) مذکورہ قسم کے مسائل کا بہترین حل یہ ہے کہ ان کے بارے میں خاموشی اور اعراض کا طریقہ اختیار کیا جائے۔ اعراض سے یہ مسئلہ صرف دو منٹ کے نعرہ پر ختم ہو جاتا

ہے اور جب مسلمان اس طرح کے مواقع پر خاموشی کے بجائے جوابی اقدام کا طریقہ اختیار کریں تو غیر ضروری طور پر وہ برا انجام سامنے آجاتا ہے جو بہار شریف اور بھاگلپور جیسے مقامات پر پیش آیا۔

سوال

جہاد کشمیر کے بارے میں آپ کا نقطۂ نظر کیا ہے۔ یہ کوئی اسلامی تحریک بھی ہے یا نہیں (پیر محمد امین ترحگام، کشمیر)

جواب

میرے علم کے مطابق یہ اور اس قسم کی دوسری مسلح تحریکیں قومی لڑائی ہیں نہ کہ اسلامی جہاد۔ اسلام میں جہاد (بمعنی قتال) کوئی انفرادی یا جماعتی عمل نہیں ہے۔ وہ مکمل طور پر ریاست کا ایک عمل ہے۔ فقہ کا ایک متفقہ مسئلہ ہے کہ: الرحیل للا مام۔ یعنی کسی قوم کے خلاف جنگ کا اعلان کرنا حاکم کا کام ہے۔ اس قسم کی موجودہ جنگیں حکومتوں کی طرف سے نہیں لڑی جارہی ہیں بلکہ انفرادی اشخاص بطور خود یہ لڑائی لڑ رہے ہیں۔ یہ بلاشبہ ایک غیر اسلامی فعل ہے۔ مزید یہ کہ کوئی مسلم حکومت اگر اس قسم کی کسی تحریک کو خفیہ مدد پہنچائے تو اس بنا پر وہ اسلامی جہاد نہیں ہو جائے گا۔ اس حکومت کو کھلے طور پر اس کا اعلان کرنا پڑے گا۔ اعلان کے بغیر خفیہ جنگ چھیڑنا بذات خود جائز نہیں۔

سوال

نفاذ اسلام کی تحریکیں موجودہ دور میں کیوں ناکام ہو رہی ہیں (پیر محمد امین، ترحگام، کشمیر)

جواب

اس ناکامی کا سبب یہ ہے کہ اسلامی قانون کے نفاذ کی تحریک چلانے والے رہنما،

ایک قدیم مثل کے مطابق، گھوڑے کے آگے گاڑی باندھنا چاہتے ہیں۔ نفاذ شریعت کے سلسلہ میں پہلا کام یہ ہے کہ سیاسی تحریک چلانے سے پہلے فکری تحریک چلائی جائے۔ لوگوں کی ذہنی اصلاح کر کے ان کے اندر قبولیت کا مادہ پیدا کیا جائے۔ اور جب لوگوں میں قبولیت کا مادہ پیدا ہو چکا ہو اس کے بعد قانون کا نفاذ کیا جائے۔ رسول اللہ ﷺ نے عرب میں یہی تدریجی طریقہ اختیار فرمایا۔ موجودہ زمانہ کا نام نہاد انقلابی طریقہ اسلامی طریقہ نہیں۔ وہ مارکس اور لینن کی تقلید ہے نہ کہ پیغمبر اسلام کی تقلید۔ موجودہ قسم کی ہنگامہ آرائیوں سے نہ اسلامی قانون نافذ ہوا ہے اور نہ وہ آئندہ کبھی نافذ ہو سکتا ہے۔ اس قسم کی تحریکیں اسلام کی خدمت نہیں ہیں بلکہ وہ صرف اسلام کو بدنام کرنے کا ذریعہ ہیں۔

سوال

اسلام کا پولٹیکل سسٹم کیا ہے۔ اسلام میں ریاست کا ہیڈ کس طرح مقرر کیا جائے گا۔ اگر شوریٰ کے ذریعہ صدر ریاست کا انتخاب ہو تو اس انتخاب کا طریقہ کیا ہے۔ امریکہ کے مسلمانوں میں اس معاملہ میں اختلاف پایا جاتا ہے۔ جو مسلمان جس ملک سے یہاں آئے ہیں وہ اپنے ہی ملک کے رائج اسلامی تعبیر کے مطابق اس کا جواب دیتے ہیں۔ اس معاملہ میں صحیح بات کیا ہے۔ (ڈاکٹر غنی خاں، میامی، امریکہ)

جواب

اس معاملہ میں اسلام میں کوئی واحد متعین طریقہ نہیں ہے۔ قرآن یا حدیث میں سیاسی معاملات کے بارے میں صرف بنیادی یا اساسی تعلیمات موجود ہیں۔ مزید یہ کہ اسلام میں چار خلیفہ کو معیاری مانا گیا ہے۔ مگر چاروں کے معاملہ میں انتخاب کا طریقہ الگ الگ تھا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اسلام میں سیاسی سسٹم کا معاملہ نماز جیسا نہیں ہے۔ نماز کا

ایک معلوم اور متعین طریقہ ہے مگر ٹھیک اسی طرح سیاست کا کوئی واحد مقرر سسٹم نہیں۔ یہ اس بات کا اشارہ ہے کہ اسلام میں سیاسی معاملات کے بارے میں کافی آزادی دی گئی ہے۔ قرآن و حدیث سے سیاست کے بنیادی اصول کو لے کر ہم اپنے حالات کے لحاظ سے اس کا آزادانہ نقشہ بنا سکتے ہیں۔ جب تک اسلام کی کسی تعلیم کی کھلی خلاف ورزی نہ ہو حالات کی مطابقت سے بنایا ہوا ہر ڈھانچہ اسلامی ڈھانچہ ہو گا۔

سوال

ایک سوال یہ کیا جاتا ہے کہ آپ نے مولانا ابوالاعلیٰ مودودی کے خلاف کتاب اس لئے لکھی کہ انھوں نے آپ کے اعتراضات کا جواب نہیں دیا۔ لیکن آپ نے بھی تو ایسا ہی کیا۔ آپ کے خلاف تنقیدیں چھپتی ہیں مگر آپ ان کا جواب نہیں دیتے۔ (محمد خالد ندوی)

جواب

ایک صورت یہ ہے کہ معترض خط کی صورت میں براہ راست اپنا اعتراض لکھ کر بھیجے ۔ دوسری صورت یہ ہے کہ وہ اپنا اعتراض یا تنقید اخبار اور رسالے میں شائع کرے۔ علماء اسلام کا مسلک یہ ہے کہ وہ براہ راست کئے گئے اعتراض کا جواب تو دیتے ہیں مگر چھپنے والے اعتراض کے بارے میں زیادہ تر خاموشی اختیار کرتے ہیں۔ میرا مسلک بھی یہی ہے۔ مولانا مودودی کو میں نے کتاب چھپنے سے پہلے اپنے اعتراض لکھ کر بذریعہ ڈاک بھیجے تھے مگر اصرار کے باوجود انھوں نے جواب نہیں دیا۔ اس بنا پر دونوں معاملہ یکساں نہیں۔ خط کے ذریعہ موصول ہونے والے اعتراض کا جواب میں ہمیشہ دیتا ہوں۔ مگر چھپے ہوئے مضمون کا جواب صرف اس وقت دیتا ہوں جب کہ وہ سب و شتم نہ ہو بلکہ اس میں واقعۃً کوئی قابل وضاحت نکتہ موجود ہو۔

۱۔ ٹائمس آف انڈیا (نئی دہلی) کی نمائندہ مسز سکینہ یوسف خاں نے ۱۴ اگست ۱۹۹۸ کو صدر اسلامی مرکز کا انٹرویو لیا۔ سوالات کا تعلق مسلمانوں کے موجودہ حالات سے تھا۔ ایک سوال یہ تھا کہ موجودہ ہندستانی مسلمان متشدد (militant) ہو رہے ہیں یا پست ہمت (subdued) ہو رہے ہیں۔ اس کے جواب میں کہا گیا کہ وہ نہ متشدد ہو رہے ہیں اور نہ پست ہمت بلکہ وہ زیادہ باشعور ہو رہے ہیں، وہ نئے عزم کے ساتھ زندگی کے میدان میں داخل ہو رہے ہیں۔ اس کا ایک ثبوت یہ ہے کہ پورے ملک میں مسلمانوں کے درمیان تعلیمی سرگرمیاں بہت بڑھ گئی ہیں۔

۲۔ کالکاجی مندر (نئی دہلی) میں ۱۴ اگست ۱۹۹۸ کو ایک سمّیلن ہوا۔ اس کا موضوع مذہب اور تعلیم تھا۔ ہر مذہب کے علماء کو اس میں اظہار خیال کی دعوت دی گئی تھی۔ صدر اسلامی مرکز کو اس میں اسلام کی نمائندگی کے لئے بلایا گیا تھا۔ انھوں نے اپنی تقریر میں کچھ حدیثیں سنائیں اور ان کی روشنی میں اسلام کا تعارف پیش کیا۔ انھوں نے بتایا کہ اسلام کوئی لڑائی بھڑائی کا مذہب نہیں، وہ اخلاق اور انسانیت کا مذہب ہے۔ اسلام میں تمام مذہبوں کا احترام کرنا سکھایا گیا ہے۔

۳۔ بخارسٹ (رومانیہ) میں ۳۱ اگست سے ۲ ستمبر ۱۹۹۸ تک ایک انٹر نیشنل کانفرنس ہوئی۔ اس کا موضوع امن اور مذہب تھا۔ اس کی دعوت پر صدر اسلامی مرکز نے اس میں شرکت کی۔ وہاں انھوں نے ایک پیپر پیش کیا جس کا عنوان تھا: Speaking of God today۔ اس کے علاوہ وہاں کے ڈسکشن میں حصہ لیا۔ اس سفر کی روداد سفر نامہ کے تحت، انشاء اللہ الرسالہ میں شائع کر دی جائے گی۔

۴۔ نوبھارت ٹائمس (نئی دہلی) کے نمائندہ مسٹر راوت نے ۵ ستمبر ۱۹۹۸ کو صدر اسلامی مرکز کا تفصیلی انٹرویو لیا۔ ایک سوال کا جواب دیتے ہوئے کہا کہ پاکستان کے لیڈر جو پاکستان کے اسلامی کرن کی بات کرتے ہیں ان کو سب سے پہلے خود اپنا اسلامی کرن کرنا چاہئے۔ پاکستان کا ایک ایک لیڈر بھرشٹاچار میں ڈوبا ہوا ہے۔ اگر سچ مچ وہ اسلام چاہتے ہیں تو سب سے پہلے انھیں اپنی زندگیوں میں اسلام کی تعلیمات کو اپنانا چاہئے۔

۵۔ سینٹ اسٹیفنس کالج (نئی دہلی) میں ۱۶ ستمبر ۱۹۹۸ کو ایک اجتماع (Assembly) تھا۔ اس میں کالج کے طلبہ اور اساتذہ شریک ہوئے۔ کالج کی دعوت پر صدر اسلامی مرکز نے اس میں شرکت کی اور لوگوں سے خطاب کیا۔ ان کی تقریر کا موضوع تھا: اسلام کے بارے میں غلط فہمی۔ تقریر میں مختلف غلط فہمیوں کا ذکر کرتے ہوئے قرآن وحدیث کی روشنی میں ان کا جواب دیا گیا۔ اور اسلام کی صحیح تصور پیش کی گئی۔ ایک بات یہ کہی گئی کہ اسلام کو خود اسلام کی تعلیمات کی روشنی میں دیکھنا چاہئے نہ کہ مسلمانوں کے عمل کی روشنی میں۔

۶۔ ساون کرپال روحانی مشن کا دس روزہ سمّیلن نئی دہلی میں ہوا۔ اس کی دعوت پر اس کے آخری دن ۲۰ ستمبر ۱۹۹۸ کو صدر اسلامی مرکز نے اس میں شرکت کی اور روحانیت کے اسلامی تصور پر ایک تقریر کی۔ اس کا خلاصہ یہ تھا کہ روحانیت کا مطلب دنیا سے الگ رہنا نہیں ہے۔ بلکہ دنیا میں رہتے ہوئے اپنے اندر روحانی شخصیت کی تعمیر کرنا ہے۔

۷۔ ٹی وی ٹوڈے (نئی دہلی) کی ٹیم نے ۲۵ ستمبر ۱۹۹۸ کو صدر اسلامی مرکز کا ویڈیو انٹرویو ریکارڈ کیا۔ سوالات کا تعلق زیادہ تر ہندستان کے فرقہ وارانہ فسادات سے متعلق تھا۔

ایک سوال کے جواب میں کہا گیا کہ پچھلے پانچ سال کے اندر اس اعتبار سے ہندستان میں نمایاں فرق ہوا ہے۔ اب ملک میں پہلے کی طرح فرقہ وارانہ فسادات نہیں ہوتے۔اس کی سب سے بڑی وجہ ہندو مسلمان دونوں کی شعوری پختگی ہے۔ ۴۵ سالہ تجربہ کے بعد دونوں نے جان لیا ہے کہ فرقہ وارانہ فساد کا نقصان ہمیشہ دونوں فریقوں کو بھگتنا پڑتا ہے۔ پہلے ایسا ہوتا تھا کہ ایک فرقہ کی طرف سے کوئی ناخوش گوار بات پیش آئے تو دوسرا فرقہ شدید رد عمل کا اظہار کرتا تھا۔ اس کا نتیجہ فساد تھا۔ اب بھی ہمارے سماج میں ناخوشگوار واقعات ہوتے ہیں مگر کوئی فرقہ شدید رد عمل کا اظہار نہیں کرتا۔اس لئے فساد کی نوبت بھی نہیں آتی۔

۸۔ گاندھی جینتی کے موقع پر اکتوبر ۱۹۹۸ کے پہلے ہفتہ میں بھوپال میں ایک سمینار ہوا۔ اس کی دعوت پر صدر اسلامی مرکز نے اس میں شرکت کی۔ اور مختلف اجتماعات کو خطاب کیا۔اس سفر کی روداد انشاءاللہ الرسالہ میں شائع کر دی جائے گی۔

۹۔ زی ٹی وی (نئی دہلی) نے ۱۲اکتوبر ۱۹۹۸ کو ایک پینل ڈسکشن ریکارڈ کیا۔اس میں اسلام کی طرف سے صدر اسلامی مرکزاور ہندو دھرم کی طرف سے بیکنٹھ لال شرما پریم اور مسیحیت کی طرف سے فادر جوئل ڈی کونھا تھے۔ اس کا موضوع کنورزن تھا۔ صدر اسلامی مرکز نے جو کچھ کہا اس کا خلاصہ یہ تھا کہ مذہبی آزادی اور کنورزن دونوں لازم ملزوم ہیں۔ چونکہ انڈیا اپنے شہریوں کو مذہبی آزادی دینے کا پابند ہے اس لئے یہاں کے شہریوں کو کنورزن کا حق بھی لازماً حاصل رہے گا۔ یہ کہنا کہ کنورزن جبری ہوتا ہے بے معنی ہے۔ سوال یہ ہے کہ اس کا فیصلہ کون کرے گا کہ جبری کنورزن ہوا ہے۔ اس کے فیصلہ کا حق صرف کنورٹ کو ہے۔ کسی تھرڈ پارٹی کو اس کا حق ہرگز حاصل نہیں۔

۱۰ نشانت کمار (فری لانس جرنلسٹ) نے ۱۳ اکتوبر ۱۹۹۸ کو صدر اسلامی مرکز کا تفصیلی انٹرویو لیا۔ سوالات کا تعلق زیادہ تر ملکی مسائل سے تھا۔ ایک سوال کے جواب میں کہا گیا کہ آزادی کے بعد نہ ہندستان میں کوئی حقیقی ترقی ہوئی اور نہ پاکستان میں۔ ترقی کا معیار میرے نزدیک ایٹمی ہتھیار نہیں ہے۔ ترقی کا اصلی معیار یہ ہے کہ عوام کو امن اور خوشحالی ملے۔ دفتروں میں رشوت کے بغیر کام ہو۔ عدالتوں میں انصاف ملے۔ بازار میں چیزیں بغیر ملاوٹ کے مل رہی ہوں۔ خالص ہوا اور خالص پانی میسر ہو۔ یہ چیزیں نہ ہندستان کے لیڈر دے سکے اور نہ پاکستان کے لیڈر۔ البتہ دونوں ایٹمی دھماکہ کر کے اس پر فخر کر رہے ہیں۔ یہ کوئی ترقی کی بات نہیں۔

۱۱۔ رسول اللہ ﷺ کی سیرت کے موضوع پر ایک نئی کتاب تیار ہوئی ہے۔ اس کا نام مطالعۂ سیرت ہے۔ وہ ۲۰۸ صفحات پر مشتمل ہے اور اس وقت زیر طبع ہے۔ انشاء اللہ جلد ہی شائع ہو جائے گی۔ یہ کتاب سیرت کا علمی اور تاریخی مطالعہ ہے۔

۱۲۔ ایک نئی کتاب چھپ کر آگئی ہے۔ جس کا نام ہے: اسلام ایک تعارف۔ یہ ۳۳۵ صفحات پر مشتمل ہے۔ اس کے ابواب یہ ہیں ـــ اسلام کیا ہے، ایہا الناس، دین رحمت، اخلاقیات، حکمت اسلام، فلاح انسانیت۔ اس کتاب کا ہر مضمون ایک صفحہ پر مشتمل ہے۔ اس میں آسان انداز میں اسلام کی آفاقی تعلیمات کو بتایا گیا ہے۔ اس کا ایک باب (ایہا الناس) علیحدہ کتاب کی صورت میں انگریزی میں بھی چھپ گیا ہے اس کا نام یہ ہے:

The Qur'an for all Humanity

روحانیت کیا ہے

روحانیت کیا ہے۔ روحانیت وہی چیز ہے جس کو قرآن میں ربانیت کہا گیا ہے۔ قرآن میں ارشاد ہوا ہے کہ اے لوگو، ربانی بنو (۳۔۷۹) اس کو دوسرے لفظوں میں اس طرح بھی کہا جاسکتا ہے کہ۔۔۔اے لوگو، روحانی بنو۔

روحانی کا لفظ مادی کا الٹا ہے۔ اس دنیا میں زندگی کا ایک طریقہ یہ ہے کہ آدمی مادی بن کر جیئے۔ وہ مادی چیزوں میں لو لگائے۔ وہ مادی یا ظاہری چیزوں کو اپنے شوق اور توجہ کا مرکز بنائے۔ ایسے انسان کو مادی انسان کہا جاسکتا ہے۔

دوسرا انسان وہ ہے جو مادیات سے اوپر اٹھ کر زندگی گزارے۔ جو غیر مادی حقیقتوں میں اپنے لئے دلچسپی کا سامان پالے۔ جس کی خوشیاں غیر مادی چیزوں کے ساتھ وابستہ ہو جائیں۔ اسی دوسرے قسم کے انسان کا نام روحانی انسان ہے۔

آپ ایک شاندار مکان دیکھتے ہیں یا ایک زرق برق کار سڑک پر دوڑتی ہوئی آپ کو نظر آتی ہے۔ یہ منظر آپ کے دل کو کھینچ لیتا ہے۔ آپ چاہنے لگتے ہیں کہ آپ کے پاس بھی ایک شاندار مکان اور ایک شاندار کار ہو۔ اسی کا نام مادی ذہنیت ہے۔ یہی وہ چیز ہے جس کو مادیات میں جینا کہا جاتا ہے۔ دوسرا انسان وہ ہے جس کے سامنے خوش نما کار یا شاندار مکان آیا تو وہ معانی کی دنیا میں اتنا زیادہ گم تھا کہ ان ظاہری چیزوں کی طرف وہ راغب ہی نہ ہو سکا۔ وہ معنوی حقیقتوں کی زیادہ بہتر دنیا میں جی رہا تھا۔ اس لئے مادی ظواہر کی کمتر دنیا سے اس کو کوئی دلچسپی نہ ہو سکی۔

جس طرح انسان کے اندر ایک روح ہے اور دوسرے اس کا جسم۔ اسی طرح بقیہ دنیا

میں بھی کچھ ظاہری چیزیں ہیں اور کچھ معنوی حقیقتیں۔ ظاہری چیزیں سطحی اور وقتی ہیں اور معنوی چیزیں گہری اور ابدی۔ روحانی انسان وہ ہے جو سطحی اور ظاہری چیزوں سے متاثر نہ ہو ۔بلکہ اس کی روح زیادہ اعلیٰ اور گہری حقیقتوں میں بسی ہوئی ہو۔

یہ بات کسی مبالغہ کے بغیر درست ہے۔ جو لوگ مادی لذتوں میں جیتے ہیں وہ سمجھتے ہیں کہ لذت(pleasure) صرف مادی لذت کا نام ہے۔ مگر یہ صرف ناواقفیت کی بات ہے۔ ان لوگوں نے صرف مادی لذتوں کا تجربہ کیا ہے۔اس لئے وہ اسی کو لذت سمجھے ہوئے ہیں۔ اگر وہ روحانی لذتوں کا تجربہ کرتے تو یقیناً وہ مادی لذتوں کو بھول جاتے۔

مادی لذتوں میں جو لذت ہے وہ وقتی اور محدود ہے۔ اس کے مقابلہ میں روحانی لذت ایک ایسی چیز ہے جس کا ذائقہ کبھی ختم ہونے والا نہیں۔

لذیذ قسم کا کھانا کھانے میں بھی لذت ہے۔ مگر لذیذ کھانا ایک بندۂ خدا کے اندر شکر کے جذبہ کا جو آبشار جاری کرتا ہے اس کی لذت کی کوئی حد نہیں۔ ایک جدید کار میں بیٹھ کر سفر کرنے میں جو لذت ہے اس سے بہت زیادہ بڑی وہ لذت ہے جب کہ انسان کار کو اور اس قسم کی دوسری چیزوں کو دیکھ کر اس حقیقت کا ادراک کرے کہ خدا نے اپنی ناقابل بیان قدرت سے وہ حیرت انگیز دنیا بنائی جو کار اور ہوائی جہاز اور اس قسم کی دوسری نعمتوں میں ڈھل کر انسان کی راحت کا سامان بنے۔

مادی انسان صرف اس لذت میں لذت لیتا ہے جو خود اس کو ملی ہوئی ہو۔ مگر روحانی انسان اس سے بلند ہوتا ہے۔ دوسروں کو سامان راحت میں دیکھ کر بھی اس کے سینہ میں شکر کا چشمہ ابل پڑتا ہے۔ دوسروں کی مادی لذت اس کے اندر روحانی لذت بن کر اتر جاتی

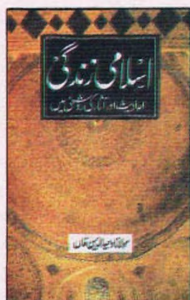
ہے۔مادی انسان صرف مخلوق کو دیکھتا ہے مگر روحانی انسان مخلوق میں خالق کا جلوہ پالیتا ہے، وہ مخلوق میں خالق کا تجربہ کرنے لگتا ہے۔اور ظاہر ہے کہ خالق کی یافت میں کسی آدمی کو جو چیز ملے گی وہ مخلوق کی یافت میں نہیں مل سکتی۔

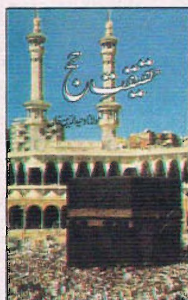
مزید یہ کہ روحانی دنیا میں غم اور راحت دونوں بالکل ایک بن جاتے ہیں۔روحانی انسان لذت کے تجربہ میں جو چیز پاتا ہے وہی بلکہ اس سے زیادہ بڑی چیز وہ اس سے محرومی میں پالیتا ہے۔اس کے لئے خوشی کے قہقہہ سے بھی زیادہ پر لذت، درد کے وہ آنسو ہوتے ہیں جو تڑپتے ہوئے دل سے نکلیں۔خدا کی یاد خود اپنی ذات میں اس کے لئے تمام لذتوں سے زیادہ بڑی لذت بن جاتی ہے۔

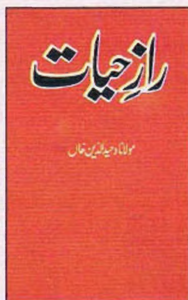
یہی وہ حقیقت ہے جس کو قرآن میں ان الفاظ میں بیان کیا گیا ہے: الا بذکر اللہ تطمئن القلوب (۲۸: ۱۳) یعنی اللہ کی یاد ہی سے دلوں کو سکون ملتا ہے۔

یہاں اطمینان سے مراد حقیقی اطمینان ہے۔ وقتی یا سطحی قسم کا اطمینان وسکون تو آدمی کو کسی بھی چیز سے مل سکتا ہے۔ مگر حقیقی نوعیت کا اطمینان وسکون کا سرچشمہ صرف خالق ہی کی ذات ہو سکتی ہے۔انسان پیدائشی طور پر ایک معیار پسند مخلوق ہے۔معیار سے کم تر درجہ کی کوئی چیز وقتی طور پر اس کے دل کو اپنی طرف مائل کر سکتی ہے۔ مگر حقیقی اور دیرپا سکون معیار کامل ہی کے ذریعہ حاصل ہو سکتا ہے۔

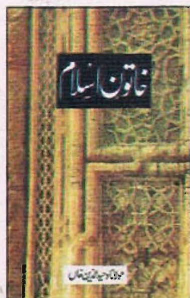
مادیت کی سطح پر جینا گویا حیوان کی سطح پر جینا ہے۔مادیت دوسرے لفظوں میں سطحیت پسندی کا نام ہے۔ حقیقی انسان وہ ہے جو روحانیت کی اعلیٰ سطح پر اپنے لئے جینے کا راز پالے۔مادیت میں اگر لذتِ قہقہہ ہے تو روحانیت میں لذتِ درد۔مادیت اگر محدود میں جینا ہے تو روحانیت کا مطلب ہے لا محدود میں جینے کا راز پالینا (ڈاکٹر فریدہ خانم)


اسلامی زندگی
مولانا وحید الدین خاں

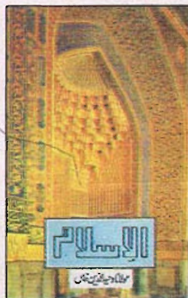

حقیقت حج
مولانا وحید الدین خاں

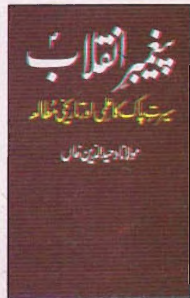

رازِ حیات
مولانا وحید الدین خاں


تجدید دین

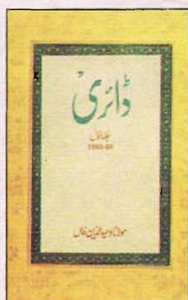

خاتون اسلام
مولانا وحید الدین خاں


عقلیاتِ اسلام
مولانا وحید الدین خاں

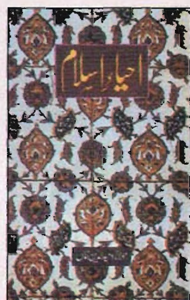

الاسلام
مولانا وحید الدین خاں


پیغمبرِ انقلاب
سیرت پاک کا علمی اور تاریخی مطالعہ
مولانا وحید الدین خاں

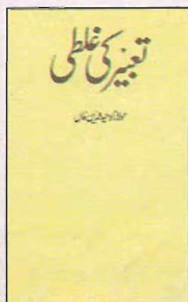

اسلامی تعلیمات
مولانا وحید الدین خاں

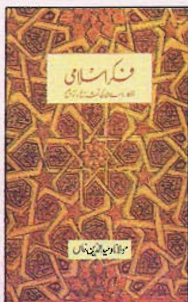

ڈائری
مولانا وحید الدین خاں


تبلیغی تحریک
مولانا وحید الدین خاں


احیاءِ اسلام


عظمتِ قرآن


تعبیر کی غلطی
مولانا وحید الدین خاں


فکر اسلامی
مولانا وحید الدین خاں


الاسلام یتحدی
وحید الدین خان
مکتبہ الرسالہ